ISSN: 2277-9833

Urdu Sheeraza

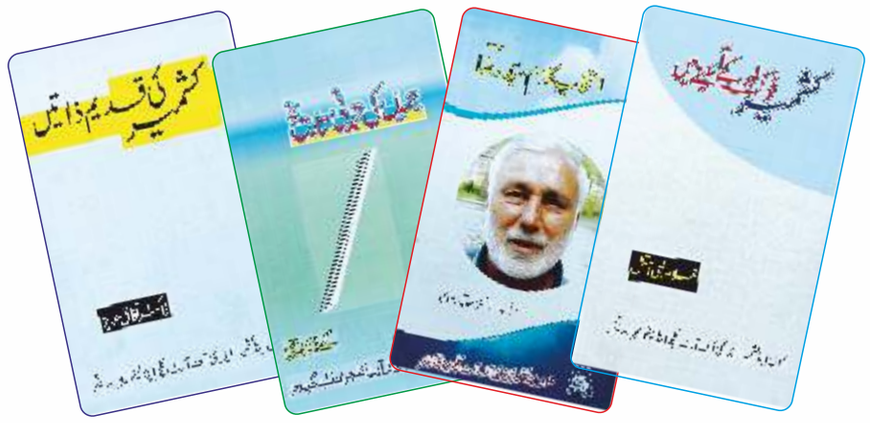

Volume: 62
Number: 1 - 2 (Jan - Feb 2024)

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

اُردو شیرازہ
Number: 1 - 2 (Jan - Feb 2024)
Volume: 62

اُردو شیرازہ

شمارے کی خاص سوغات

- مابعد جدیدت سے آگے؟
- ادبی متون کیسے پڑھیں؟
- پیر پنچال کے غیر مسلم ادبا و شعرا (قسط اوّل)
- نرسنگداس نرسنگھ: ہمہ جہت تخلیق کار
- آغا اشرف علی: استاد، عاشق اور کیمیا گر
- شیخ علی محمد ماہر: ایک ادیب، ایک فن کار
- ڈاکٹر رضیہ حامد: اردو کی ایک ممتاز ادیبہ
- اردو شاعری میں روزمرہ کا استعمال
- دیپک بدکی کی افسانہ نگاری
- ایاز رسول نازکی کی غزلیہ شاعری
- کہنہ مشق، فکر فردا، تخلیقی سفر، افسانے، شاعری، ڈراما، تبصرۂ کتب

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نِگراں : بھرت سنگھ منہاس

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق: امتیاز احمد شرقی، محمد انور لولابی
پبلیکیشن آفیسر : ڈاکٹر شاذیہ بشیر ، معاونین: شبیر احمد میر، طاہر سلطان
سال اشاعت : جلد؛62، شمارہ:2-1 (جنوری/فروری2024)
ISSN نمبر : 2277-9833
قیمت : 50روپے

'شیرازہ' میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

● ..... خط و کتابت کا پتہ:
مدیر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

❁ گفتگو بند نہ ہو!	محمد سلیم سالک	۵
● مضامین		
❁ مابعد جدیدیت سے آگے؟	پروفیسر قدوس جاوید	۷
❁ ادبی متون کیسے پڑھیں؟	پروفیسر ناصر عباس نیّر	۳۹
❁ پیر پنچال کے غیر مسلم ادبا و شعرا (قسط اوّل)	ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی	۵۰
❁ نرسنگداس نرگس: ہمہ جہت تخلیق کار	ولی محمد اسیر کشتواڑی	۷۱
❁ ڈاکٹر رضیہ حامد: اردو کی ایک ممتاز ادیبہ	محمد نذیر فدا	۱۰۰
❁ اردو شاعری میں روزمرہ کا استعمال	ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی	۱۰۹
❁ دیپک بدکی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۱۲۱
❁ ایاز رسول نازکی کی غزلیہ شاعری	ارشاد آفاقی	۱۲۶
● یاد رفتگاں		
❁ آغا اشرف علی: استاد، عاشق اور کیمیا گر	محمد یوسف ٹینگ	۱۳۸
❁ شیخ علی محمد ماہر: ایک ادیب، ایک فن کار	پروفیسر اسد اللہ وانی	۱۴۹
● غزلیات		۱۶۸
رؤف خیر، حیات عامر حسینی، محمد اطہر، آصف عطاء اللہ، عمر فیاض، یونس ڈار، منتظر رسول، وقار دانش		۱۸۳
● میرا تخلیقی سفر		
زندگی کے کئی رنگ ہوتے ہیں!!	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	۱۸۴
● منظومات		۱۹۲
طہور منصوری نگاہ، جبینت پرمار، خورشید اکرم، ارشد عبدالحمید، نجمہ ثاقب، گلزار جعفر		۲۰۵

● **کھنہ مشق**

فلک رنگ نظمیں — زاہد مختار — ۲۰۶

● **فکر فردا**

مٹھی بھر غزلیں — اشہر اشرف — ۲۱۵

● **افسانے**

❁ مدھ بھرے رومانی خطوط — عبدالغنی شیخ — ۲۲۰

❁ گرہ — ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا — ۲۲۸

❁ چور — بلراج بخشی — ۲۳۷

❁ کلونت کور کی واپسی — راجہ یوسف — ۲۴۴

● **ڈراما**

❁ ادھورا ناول — نور شاہ — ۲۵۰

● **تبصرۂ کتب**

❁ رسالہ حکیم الامت ''نعت نمبر'' (ڈاکٹر ظفر حیدری) — مبصر: مرزا بشیر احمد شاکر — ۲۷۶

❁ تجلیات معرفت (ڈاکٹر الطاف حسین یتو) — مبصر: ڈاکٹر محمد اقبال لون — ۲۸۳

❁ مٹی کے موسم (بلراج بخشی) — مبصر: ڈاکٹر جگ موہن — ۲۸۷

❁ نور شاہ کی فکشن نگاری (ڈاکٹر محمد مصطفیٰ بیگ) — مبصر: ڈاکٹر مختار احمد — ۲۹۱

❁ بے سمت قافلے (طارق شبنم) — مبصر: ڈاکٹر عرفان رشید — ۲۹۶

☆☆☆

گفتگو بند نہ ہو!

ایک طویل عرصے سے بحث چلی آ رہی ہے کہ کیا ادبی متون کی تفہیم کے لئے کسی خاص نظریہ یا تھیوری کا سہارا لینا ناگزیر ہے؟ اس سوال کے جوابات سیاق و سباق کے تناظر میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات سے سب اتفاق کریں گے کہ اگر ان نظریوں سے کوئی دلبرداشتہ ہو کر الگ تھگ رہنے میں عافیت محسوس کرنے لگا ہے تو وہ صرف ''قاری'' ہے۔ اکیسویں صدی تک آتے آتے قاری کے ناتواں کندھوں پر تھیوریوں کا اتنا بوجھ ڈالا گیا کہ وہ ادب سے ہی متنفر ہو گیا ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مغربی نظریات کی پیوندکاری مشرقی شعریات میں اس طرح کی گئی ہے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی خلط ملط کا شکار ہو گیا اور قاری فلسفہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر دور میں نظریات بدلتے رہے ہیں اور ہر نئے نظریئے نے اپنے پیش رو نظریئے کی تائید کرنے کی بجائے اس کو رد کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ سلسلہ کئی دہائیوں سے چلتا آ رہا ہے اور اس صورت حال کے پیش نظر یہ کہنا کہ مستقبل میں کوئی نظریہ دوام پائے گا، قدرے مشکل ہے۔ اسی تناظر میں آج مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں آج کے شمارے میں خصوصی طور پر پروفیسر قدوس جاوید نے مابعد جدیدیت کے مستقبل کے حوالے سے ایک معلوماتی اور چشم کشا مقالہ تحریر کیا ہے جس سے کئی سوالات جنم لیتے ہیں اور کئی فلسفیانہ گتھیاں بھی سلجھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

زیر نظر شمارے میں ''یادِ رفتگاں'' کے تحت دو مقالات شامل کئے گئے ہیں۔

اول الذکر مقالہ جناب محمد یوسف ٹینگ نے عالمی شہرت یافتہ ماہر تعلیم پروفیسر آغا اشرف علی کی علمی وادبی شخصیت کو اجاگر کرتے ہوئے کئی اہم باتیں زیر بحث لائیں ہیں، جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کس پائے کی شخصیت تھے۔ دوسرا مقالہ پروفیسر اسد اللہ وانی نے نہایت غیر معروف شاعر مرحوم شیخ علی محمد ماہرؔ کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ مرحوم ماہرؔ نہایت کم عمری میں جہان فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔

حال ہی میں ہمارے ایک نوجوان ادیب اور اسکالر ارشاد آفاقی جوان مرگ ہو گئے۔ زندگی کی صرف بیالیس بہاریں دیکھنے کے بعد اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم آفاقی شیرازہ کے دیرینہ قلمی معاونین میں تھے۔ اکثر وبیشتر ''شیرازہ'' کے لئے خصوصی طور پر مضامین تحریر کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ قریب المرگ ہونے کے وقت انہوں نے کشمیر کے مایہ ناز شاعر ایاز رسول نازکی کی شاعری کے حوالے سے ایک عمدہ مضمون تحریر کیا تھا، جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم اردو شعریات کی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ شومئی قسمت اگر زندگی وفا کرتی تو ہمیں مستقبل میں ایک ہونہار نقاد ملنے کی امید تھی۔ لیکن خدا کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

ہماری کوشش رہی ہے کہ حسب سابق دیگر مشمولات کے ساتھ ساتھ تخلیقی سفر، منظومات، افسانہ اور ڈراما کا سلسلہ بھی جاری وساری رہ سکے۔ مذکورہ شمارہ ترتیب دینے میں شیرازہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جناب سلیم ساغرؔ، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر محمد اقبال لون اور معاون امتیاز احمد شرقی کا کلیدی رول ہے، جس کے لئے یہ سب شاباشی کے مستحق ہیں۔

ایڈیٹر ''شیرازہ'' اردو
محمد سلیم سالک

☆.....پروفیسر قدوس جاوید

مابعد جدیدیت سے آگے؟

''زندہ زبانوں کی ثقافت ہو یا شعریات، یہ اندر سے بند نہیں ہوتیں، جامد نہیں ہوتیں، نئے اور پرانے کی آویزش و پرکار سے ان میں خود انضباطی اور ہم آہنگی کا جدلیاتی عمل برابر جاری رہتا ہے اور سابقہ بنیادوں پر نئے معیار بنتے رہتے ہیں اور سابقہ معیاروں کی بازآفرینی بھی ہوتی رہتی ہے۔[1]

اس قول کا اطلاق اکیسویں صدی میں اردو شعریات پر بھی ہوتا ہے۔ دراصل اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آکر اردو دنیا میں بھی زبان، زندگی، زمانہ، ذات، ذہن، عقائد، آستھا، ادب، سماج سے متعلق سوچ اور فکر کے انداز تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ایک فکری اکتساب سے دوسرے فکری اکتساب تک سچائیاں بدل جاتی ہیں۔ صحیح اور غلط کی کشمکش نے ملک کے ماحول کو تشویش اور تذبذب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ضرورت شعر وادب ہی نہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں مثبت اور تعمیری غور وفکر سے کام لینے کی ہے لیکن مخصوص نظریات، آئیڈیالوجی، عقائد، آستھا اور ثقافت کے جبری انطباق کے سبب جو حالات پیدا ہو رہے ہیں، اس میں اردو شعر وادب کے لئے بھی یہ سوال اہم ہو گیا ہے کہ آج کی تاریخ میں ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت (اور مذہبیت) کے حوالے سے، کن فکری بصیرتوں سے روشنی حاصل کی جائے؟

اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ادب پنپتا ہی ہے افتراق واختلاف رائے سے۔ ہر ادبی نظریہ، رویہ، رجحان، یا تحریک کے اندر ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جس سے اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے اور اختلاف بھی، کسی مخصوص نظریہ یا رجحان کو مستقل حیثیت دے دینے سے بعض آسانیاں تو پیدا ہوتی ہیں لیکن فکر ونظر کے کئی دوسرے راستے بند بھی ہوجاتے ہیں۔ جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن فاروقی نے بیسویں صدی کے آخیر میں ہی لکھا تھا :

''جدیدیت کوئی مذہب نہیں، کوئی الہامی فلسفہ نہیں جس سے انحراف کفر ہو، ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا برا کر چکے گی، کوئی اور نظریہ ادب اس کی جگہ لے لے گا، میں اس دن کا منتظر ہوں''[۲]

انہیں دنوں اردو میں مابعد جدیدیت کے آواں گارد گوپی چند نارنگ نے بھی جدیدیت کے طلسم کو توڑتے ہوئے لکھا تھا :

''نئے عہد کی پیچیدگیاں، انسانی قدروں کا زوال، عالمی طاقتوں کی جنگ زرگری، تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال، پس ماندگی، افلاس، جہالت اور بے روزگاری ایسے مسائل ہیں جو نئے اظہاری پیرایوں کا تقاضہ کرتے ہیں''[۳]

ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت ایک سماجی، ثقافتی اور ادبی سچائی کے طور پر نئی صدی کے آغاز سے پہلے ہی اپنی اہمیت منوا چکی تھی لیکن اب اس صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے، عالمی پیمانے پر اور اردو دنیا میں بھی بعض حلقوں کی جانب سے ''مابعد جدیدیت کی موت'' (Death of Post Modernism) کی باتیں بھی کی جانے لگی ہیں اور ایک طبقہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ

مابعد جدیدیت کے بعد کیا؟ اس طرح کے کسی بھی سوال کو ہلکے میں نہیں لینا چاہئے اور اس پر غور کیا جانا چاہئے کہ کیا واقعی مابعد جدیدیت کی موت ہوچکی ہے؟ اگر یہ سوچ درست ہے تو پھر اس پر بھی غور کیا جانا چاہئے کہ ترقی پسندی کو جدیدیت نے معزول کیا تھا اور جدیدیت کی جگہ مابعد جدیدیت نے لے لی تھی، لیکن اب مابعد جدیدیت کا متبادل (Alternative) کیا ہے؟ یا کیا ہوسکتا ہے؟۔

دراصل آج اکیسویں صدی میں دنیا اور خصوصاً برصغیر ہند و پاک کے تازہ ترین سماجی و سیاسی، معاشی و ثقافتی اور مذہبی و اخلاقی حالات خود مابعد جدیدیت کے بہت سارے نکات و نظریات کے آگے سوالیہ نشانات قائم کر رہے ہیں بلکہ ادب، ثقافت اور شعریات کے بدلتے تیوروں کے حوالے سے مابعد جدیدیت سے بھی بے اطمینانی اور اس سے آگے کی باتیں بھی ہونے لگی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز سے سماج اور ثقافت کے علاوہ شعر و ادب کی مروجہ صورت حال سے بے اطمینانی کی لہر عام ہوچکی تھی۔ اسی عرصے میں نطشے کے Death of God کے اعلان کی طرز پر کئی طرح کے انتہا پسندانہ اعلانات بھی کئے گئے مثلاً۔ ''انسان اور انسانیت کی موت'' (Foucault 1994) ''تاریخ کی موت'' (.1992 Fukuyama) ''ادب و فن کی موت (Dante1998) 'مصنف کی موت' (رولاں بارتھ)، جدیدیت کی موت (ٹامس میکارتھی) وغیرہ۔ حسن عسکری نے بھی آزادی/ تقسیم ملک کے بعد اردو ادب کی موت کا اعلان کیا جس پر انتظار حسین نے سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۹۹۳ء میں گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کی اشاعت کے بعد اردو ادب میں باضابطہ طور پر ''مابعد جدیدیت'' کے بال و پر نکلتے ہیں اور مابعد جدید شعریات کی تشکیل کا عمل شروع

ہوتا ہے۔لیکن ۱۹۹۳ء کے آس پاس ہی مغربی مابعد جدیدیت کے ایک بڑے علم بردار لیوتار Leotard. J.F نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جدیدیت کی طرح مابعد جدیدیت کے حوالے سے بھی جو ادب لکھا جا رہا ہے اس میں بہت ساری باتیں اتنی مبہم، پیچیدہ اور غیر واضح ہیں کہ قارئین تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی''۔ گوپی چند نارنگ نے بھی مانا تھا کہ:

> ''مابعد جدیدیت میں بہت سی باتیں دقت طلب ہیں۔ایسا اس لئے بھی ہے کہ جن لوگوں کی واقفیت سرسری ہے یا جو نئے خیالات سے بھڑکتے ہیں وہ عمداً انتشار بھی پھیلاتے ہیں، یا آدھی ادھوری یا غلط سلط باتیں بھی کرتے ہیں''[۴]

خود مابعد جدیدیت کے کئی حامی دانشور بھی شروع سے ہی مابعد جدیدیت کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں۔کیوں کہ بہر حال مابعد جدیدیت بھی کوئی آسمانی فرمان نہیں، انسانی سماج اور ثقافت کے بدلتے تقاضوں اور حالات کے پیدا کردہ نظریات (تھیوریز) کا مجموعہ ہے، جو نہ تو جامد ہے اور نہ ہر عہد کے لئے حتمی، مستقل اور متعین۔ دراصل ہر عہد کی الگ الگ علمیات (EPISTEME) کے حوالے سے مسائل، مباحث، ڈسکورسیز، اور بیانئے (Narratives) بھی الگ الگ ہوتے ہیں، جو بعض سابقہ اور حالیہ ڈسکورس اور Narratives کو رد بھی کرتے ہیں، ترمیم و تشکیل جدید بھی اور بعض نئے پہلوؤں کا اضافہ بھی۔ ویسے بھی تیز رفتار تبدیلیوں کے سبب ہر پانچ، دس سال کے بعد سماجی، سیاسی اور ادبی و ثقافتی اقدار اور رویوں کی طرح ادبی نظریہ رجحان اور شعریات میں بھی تازہ کاری نمایاں ہوتی ہے جسے کوئی نیا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج اگر مابعد جدیدیت کے مقابل بھی بعض نئے نظریات پیش کئے جا رہے ہیں تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔تعجب اور افسوس اس وقت ہوتا ہے

جب انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے بعض لوگ ان جڑوں پر ہی وار کر بیٹھتے ہیں جن پر پیڑ قائم ہے۔

جرگن ہیبر ماس (Jurgen Habermas) نے بھی ۱۹۹۱ء ہی میں مابعد جدیدیت کو ''نو قدامت پسندی'' (Neo conservatism) قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی تھی اور ''مابعد جدیدیت اور مابعد جدید شعریات کو، Enlightenment Project of Modernity کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، حالانکہ Linda Hucheon نے اپنی کتاب Poetics of Post Modernism میں لکھا ہے کہ جرگن ہبرمس مابعد جدید یت کے مضمرات اور امکانات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ رچرڈ گاٹ اور بیری اسمارٹ نے بھی بیسویں صدی کے اخیر میں تعمیری انداز میں ہی سہی، مابعد جدیدیت اور مابعد جدید شعریات کی بعض خامیوں کو دور کرنے کی باتیں کی تھیں۔ اکیسویں صدی میں، سرمایہ داریت کے حامی بعض 'احیا پرست'' (Revivalist) دانشور مابعد جدیدیت کے خلاف محاذ کھولنے کی کی مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے، فرانس کے ایک (اوسط) نقاد اور نظریہ ساز نکولس بوریو Nicolas Bourriad (پیدائش ۱۹۶۵ء) نے ۴ فروری ۲۰۰۹ء کو برطانیہ کی ''ٹیٹ آرٹ گیلری'' (Tate Art Gallery) کی نمائش میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے ''مابعد جدیدیت کی موت'' Death of Post Modernism کا اعلان کیا اور اس کی جگہ Alter Modernism یعنی ''متبادل جدیدیت'' کا تصور پیش کیا۔ نکولس بوریو کے مطابق:

> ''متبادل جدید یت'' عصری سماج اور ثقافت میں ہر طرح کی معیار بندی (Standardisation) اور صارفیت (Consumerism) پر مبنی کاروباری مزاج اور ماحول کے

خلاف ردعمل سے عبارت ہے۔''

نکولس بوریو، پیرس میں ایک آرٹ اسکول اور آرٹ میگزین کا ڈائریکٹر بھی رہا۔ادب وفن کو مس کرتے ہوئے اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً

۱۔ Relational Aesthetics 1998

۲۔Postproduction 2001

۳۔Radicant 2009

۴۔ The Exform 2015

بوریو چونکہ خود ایک نمائش کار(EXHIBITIONIST) تھا اس لئے اس نے اپنی کتاب 'پوسٹ پروڈکشن' میں معاصر ادب وفن کی پیشکش کا رشتہ تفریحی پروگراموں کی پیش کاری Deejaying سے جوڑنے کی کوشش کی۔نکولس بوریو مابعد جدیدیت اور مابعد جدید دانشوروں کا مخالف تھا اس لئے اس نے ترجموں اور سُنی سُنائی باتوں اور خوش گپیوں کی بنیاد پر مابعد جدیدیت اور اس کی شعریات پر شدت کے ساتھ اعتراضات کئے۔اس ضمن میں اس نے اپنی کتاب Exform میں مشہور مابعد جدید دانشور رالوئی آلتھو سے (Louis Althusser) کے تصورات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فتویٰ صادر کیا کہ آلتھو سے (1990--1918) کے افکار و خیالات انسانی معاشروں کے لئے کسی کام کے نہیں۔لیکن چونکہ بوریو کوئی معتبر اور مستند ادیب یا مفکر نہیں بلکہ ایک نمائش کار(Curator) تھا اس لئے فرانس اور برطانیہ میں بھی ''مابعد جدیدیت کی موت'' سے متعلق اس کے اعلانیے کا زیادہ سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ مابعد جدیت کی موت اور اس کی جگہ ''متبادل جدیدیت'' کا تصور' پیش کرتے ہوئے بوریو نے متبادل جدیدیت کے جن امتیازات کی نشان دہی کی ہے وہ بیشتر مابعد جدید تصورات کا ہی حصہ رہے ہیں،البتہ بوریو نے انہیں

بس ذرا پہلو بدل کر پیش کیا ہے۔ اس لئے بوریو کے ''متبادل'' ''جدیدیت'' (Alter Modernism) کے تصور کو مابعد جدیدیت کی من مانی توضیح وتشریح تو کہا جاسکتا ہے، قابل قبول نعم البدل متبادل (Alternative) قرار دینا مشکل ہے، مثلاً مابعد جدیدیت کی طرح، بوریو کا 'متبادل جدیدیت' کا تصور بھی عالمی ثقافتی صورت حال کو مرکز میں رکھنے پر زور دیتا ہے۔ ساتھ ہی بوریو یہ بھی کہتا ہے کہ ہر ملک معاشرہ میں مختلف الخیال انسانی گروہ رہتے ہیں، ان گروہوں کے حالات اور مسائل بھی مختلف النوع ہوتے ہیں، لہٰذا ادب میں ان سبھی انسانی گروہوں کے سماجی وثقافتی اقدار، مسائل اور معاملات کو اس طرح پیش کیا جانا چاہئے کہ ان کی آزاد اور خودمختار سماجی و ثقافتی پہچان بھی مجروح نہ ہو اور عالمی سماجی وثقافتی حالات وکیفیات سے ان کا رشتہ بھی قائم رہے۔ دوسرے لفظوں میں بوریو بھی مابعد جدیدیت کی طرح یہ مانتا ہے کہ اکیسویں صدی مخلوط (ملی جلی) ثقافت (Plural Culture) کی صدی ہے لہٰذا سماج اور شعر وادب میں بھی، مخلوط ثقافت پر توجہ ضروری ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں، مابعد جدیدیت بھی عالم انسانیت کی فلاح کے لئے، مقامی ماحول معاشرہ Subaltern Society کی ترجمانی میں 'عالمی ثقافت' کو مرکز میں رکھنے پر زور دیتی ہے۔ دوئم نکولس بوریو مابعد جدیدیت کے اس نظریئے کو بھی دہراتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہر طرح کی مذہبی، اخلاقی، انسانی اور ثقافتی روایات واقدار کے زوال کے سبب عالمی سطح پر ایک ''نئی ثقافت'' جلوہ گر ہو چکی ہے، ترسیل وابلاغ، اور آمد ورفت کے وسائل میں ہوش رُبا اضافہ نے صحیح معنوں میں گلوبلائزیشن کے ایک نئے اور زیادہ حقیقت پسندانہ تصور کو جنم دیا ہے۔ نکولس بوریو اپنے متبادل جدیدیت کے نظریہ کو اسی نئی عالمی ثقافت کے فروغ کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس نئی ثقافت کو وہ ایک Tool Box یا ایک خلا Narrative Space مانتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب Post Production میں،

مابعد جدیدیت کی موت کے مفروضے کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فن کاروں کو اپنی تخلیقات میں فکری خالی پن، غیاب یا صفریت (شونیتا) کا رویہ اختیار کرنے، یا پھر ’تاریخ‘ کا بارگراں اٹھانے کے بجائے نئی عالمی ثقافتی صورت حال میں تازہ کاری کے لئے معانی ومفاہیم پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور اپنے عہد کے سماج اور ثقافت کے تناظر میں ادبی وفنی اظہار و بیان کے نئے پیرائے اختیار کرنے چاہئیں، کیونکہ ادب وفن میں کوئی بھی تحریک یا رجحان اپنے عہد کے حالات کی آمیزش وآویزش سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

قلم کاروں کو اس طرح کے ناصحانہ مشورے، ’نو مارکسی اور مابعد جدید دانشوروں جارج لوکاچ، ٹیری ایگلٹن اور آلتھوسے، مشل فوکو، فریڈرک جیمسن، بودریلارد اور اِہاب حسن اور ایڈورڈ سعید وغیرہ کے یہاں بھرے پڑے ہیں۔ اردو میں گوپی چند نارنگ نے بھی نئے دور کے چیلنجز کے پیش نظر ادب میں اظہار و بیان کے نئے رویے اور پیرایے اختیار کرنے کی بات کہی ہے۔

نکولس بوریو نے مابعد جدیدیت کی موت کے مفروضے کی تشہیر اور اپنے متبادل جدیدیت کے نظریے کو فروغ دینے کے لئے ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ ۲۰، مارچ ۲۰۰۹ء کو برطانیہ کے سنیما گھروں میں The Age of Stupids نامی ایک فیچر فلم کی نمائش کروائی جس میں ایک تنہا آدمی (جدیدیت کا تنہا آدمی) کو صدیوں کی جدوجہد کے بعد تشکیل پذیر ہونے والے عالمی انسانی سماج اور تہذیب وتمدن کی تباہی و بربادی کا ماتم کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس فلم میں پیش گوئی کے طور پر بتایا گیا تھا کہ ۲۰۱۵ء تک عالمی سطح پر سماج، ثقافت اور ماحولیات میں اس قدر وحشت ناک تبدیلیاں رونما ہوں گی جنہیں پلٹنا انسان کے بس سے باہر ہوگا اور انسان عالم وحشت میں زندگی سے فرار کا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جائے گا۔ (برِصغیر ہندو پاک ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا ہے؟) لیکن یہ کوئی انوکھی بات

نہیں، انسان ایک عرصہ سے فکری ونظریاتی انتشار و بحران سے دوچار ہے۔

بور یو سے بہت پہلے، نو مارکسی نقاد ٹیری ایگلٹن نے بھی اپنے ایک لیکچر The Significance of Theory میں ادب اور زندگی کے لئے تعمیری ''نظریہ سازی'' کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس وقت انسان اور تمام انسانی علوم زبردست بحران سے دوچار ہیں اور انسانی علوم کو اس بحران سے نکالنے کے لئے کوئی نظریہ ''تھیوری'' بہت ضروری ہے کیوں کہ تھیوری انسانی زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ جہاں زندگی ہے وہاں کوئی نہ کوئی نظریہ بھی ضرور ہے اور چونکہ انسان کی سماجی زندگی کا ہر رنگ ہر پہلو چونکہ ایک اصولی معنی Theoritical Meaning رکھتا ہے اس لئے ٹیری ایگلٹن کا یہ کہنا غلط نہیں کہ Just as our social life is theoritical so all the theory is real social life (گوپی چند نارنگ نے 'ساختیات، پس ساختیات میں یہی بات دہرائی ہے)۔

اگر دیکھا جائے تو بور یو سستی شہرت کا طلب گار، سرمایہ داریت کا حامی، مارکسزم اور مابعد جدیدیت سے متعلق آدھی ادھوری واقفیت رکھنے والا ایک کنفیوزڈ شخص ہے اور اس کا متبادل جدیدیت کا تصور ایک پیچیدہ، منتشر الخیال اور متعصّبانہ تصور ہے، جو مارکسزم، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نظریات اور شعریات کو رد کرنے پر اصرار تو کرتا ہے لیکن اس کا ''متبادل جدیدیت'' کا تصور اتنا جامع اور واضح نہیں ہے کہ اسے ایک ایسے نظریہ کے طور پر قبول کیا جا سکے، جو اکیسویں صدی کے سماجی وثقافتی اور ادبی انتشار و بحران کے تناظر میں انسان اور انسانیت کے مستقبل کے تحفظ اور تعمیر میں، (نو مارکسیت) نئی ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت سے زیادہ کارگر نظریہ ثابت ہو سکے۔ بور یو نے تاریخ سے متعلق مارکس کے نظریئے کو بھی پلٹنے کی کوشش کی ہے۔

مارکس نے تاریخ کو 'لا مرکز' (De centralise) کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'انسان اپنے 'ظاہری و باطنی حواس کو ترقی دے کر اپنی 'تاریخ' خود بناتا ہے۔ لیکن بوریو تاریخ سے ناوابستگی پر زور دیتے ہوئے، مستقبل کی تعمیر کے بجائے ماضی کی تاریخ پر توجہ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ بوریو کے خیال میں:

> History is the last uncharted continent, and therefore should be the focus of artistic attention.

جب کہ مارکسیت/ ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت دونوں ہی تخلیق کاروں پر ادب کے وسیلے سے پوری انسانی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے انسان اور انسانیت کا مستقبل سنوارنے پر زور دیتی ہیں۔ مارکس نے ''سماجی انقلاب کی شاعری'' میں لکھا ہے کہ '' سماجی انقلاب کی تحریک ماضی سے نہیں مستقبل کی فکر سے ملتی ہے۔ جب تک ماضی کے اوہام سے نجات نہ حاصل کر لی جائے انقلابی شاعری نہیں ہوسکتی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ماضی پرستی کی تردید میں آئی۔ اے رچرڈس (I.A.Richards) کے ہیئت پسند تصورات کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''وہ حافظہ میں پڑی ہوئی بے عمل یادداشتوں، جذباتی احرامات، مذہبی عقائد اور وفا داریوں کو بھی ظاہر پرستانہ اور غیر ضروری رجحانات سمجھتا ہے۔'[۶]

بوریو کا دعویٰ ہے کہ چونکہ مابعد جدیدیت کی بنیاد مغربی تہذیب و ثقافت پر قائم کی گئی تھی، ساتھ ہی جدیدیت کا رجحان بھی شروع سے ہی عالمی رجحان رہا ہے جس نے ایک سیال اور لچکدار سماج، ثقافت اور شعریات کی تشکیل کی ہے۔ لہٰذا وجودیت، فردیت، اشاریت جیسے نظریات پر مبنی اس عالمی جدیدیت کو ہی اب

ترمیم وتنسیخ کے عمل سے گزار کر ''متبادل جدیدیت'' کے نام سے پیش کیا جارہا ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ''Alter Modernism کی ترکیب میں مستعمل (لاطینی) لفظ Alter کے معانی مختلف، منفرد یا دوسرا پن وغیرہ ہیں۔لیکن بوریو لفظ Alter کو Alternative (متبادل) سے بھی کچھ الگ مانتا ہے۔کیونکہ Alter Modernism پہلے سے موجود Modernism کی اصطلاح کے معمولی معنی ومفہوم کو رد کرتے ہوئے ایک ''نئی جدیدیت'' کی بات کرتی ہے۔بوریو نے ''مابعد جدیدیت کی موت'' کا اعلان کرتے ہوئے اپنی اس نئی (متبادل) جدیدیت کے بارے میں مزید جو چند بنیادی اور کئی اعتبار سے قابل غور وضاحتیں پیش کی ہیں، وہ اس طرح ہیں۔

ا۔متبادل جدیدیت کی شکل میں ایک ''نئی جدیدیت'' کا عروج ہورہا ہے، جس کی غرض وغایت گلوبلائزیشن کے عہد کے جدید تقاضوں کو مربوط ومنظّم کرکے ان کے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی سروکاروں کو سمجھنا سمجھانا ہے۔

۲۔ترسیل وابلاغ کے ذرائع، مسافرت اور معاشی وجوہات کے سبب گھر بار چھوڑنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کی مجبوری، ہجرت، انسان کی زندگی ہی نہیں، اس کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی متاثر کررہی ہے۔

''تمام عمر چلے پھر بھی گھر نہیں آیا''

۳۔اکیسویں صدی میں پوری دنیا میں جاری ہنگامہ آرائی اور شور شرابہ نے عام انسانی زندگی کو مجہول کردیا ہے۔

۴۔مختلف اور متضاد تہذیبوں کی کثرت اور ان کی باہمی کشاکش بلکہ متشدد ٹکراؤ نے تہذیبی رنگارنگی Multi Culturalism کے مثالی مخلوط ثقافت (گنگا جمنی تہذیب) کے تصور کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

۵۔''نو عالمیت''(Neo Globalisation) کا انحصار ترجمہ، اضافی تشریح نئی ترکیبات و اصطلاحات اور اظہار و بیان کی سادگی اور سہل نگاری پر ہے۔''متبادل جدیدیت''اس کی پیروی پر اصرار کرتی ہے۔

۶۔کسی بھی فن پارہ میں زمان ومکان، علامت واستعارہ، اور وقفہ Space کے درمیان آپس میں جو رشتہ ہوتا ہے، متبادل جدیدیت اسے نمایاں کرتی ہے۔

۷۔متبادل جدیدیت کے تحت شاعر وادیب، عالمیت کے نئے شعور کے حوالے سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، اس ضمن میں شاعر وادیب اشاروں کنایوں پر مبنی ''ثقافتی منطلقوں'' کے سیدھے اور ٹیڑھے مرحلوں سے گزرتے ہیں اور اظہار و بیان اور ترسیل وابلاغ کی نئی ہیئتوں اور پیرایوں کی ایجاد کرتے ہیں۔

سطحی طور پر بوریو کی کئی باتیں منطقی اعتبار سے حقیقت کے قریب محسوس ہوتی ہیں لیکن جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے امتیازات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہیبر مس کی طرح بوریو بھی زبان وادب کے تخلیقی مضمرات اور سماجی وثقافتی محرکات کی گہری آگہی سے محروم ایک 'کج فہم' اور کم علم شخص ہے۔نکولس بوریو کی تحریروں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسے اس بات کا قطعی علم نہیں کہ سوسئیر (Saussure) کے زبان کے بارے میں کیا نظریات ہیں اور ژاک ڈریڈا(Derrida) نے معنی کی 'وحدت' کو کن بنیادوں پر بے دخل کیا ہے اور روسی ہیئت پسندوں (Formalists) نے Literaryness of Literature پر کیوں زور دیا ہے؟۔اس لئے، بوریو تشفی بخش طور پر یہ واضح نہیں کرسکا ہے کہ مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان کرنے کے پیچھے اس کا مقصد مدعا کیا ہے؟ اور اس ضمن میں اس کے قابل قبول دلائل کیا ہیں اور متبادل جدیدیت'' سے اس کی قرار واقعی کیا مراد ہے؟ واقعتاً بوریو نے متبادل جدیدیت کی حمایت میں جو نکات پیش کئے ہیں، 'نو

مارکسیت' اور مابعد جدیدیت ان پر بہت پہلے سے زور دیتی رہی ہیں۔اس لئے بوریو کے 'متبادل جدیدیت' کے تصور کی حمایت میں کوئی بھی معتبر نام سامنے نہیں آیا۔ ویسے یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی تک آ کر دنیا بہت بدل چکی ہے۔اردو ادب کا سب سے بڑا منطقہ/مرکز برِصغیر (ہندوستان، پاکستان) بھی اب اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آ کر وہ نہیں رہا جو بیسویں صدی کے اخیر یا اکیسویں صدی کے اوائل تک تھا۔اس بات کا اندازہ حالیہ ''دلت ادب'' اور اردو کے ''اقلیت اساس'' اشعار، نظموں، افسانوں اور ناولوں (حسین الحق، عبدالصمد، ذکیہ مشہدی، اسلم جمشید پوری وغیرہ) سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ماحول معاشرہ میں منفی اور مثبت، متشدد اور مضحکہ خیز تصورات دمفروضات کا اژدہام ہے۔لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ سماج، ثقافت اور ادب میں 'مابعد جدیدیت کی موت'' کے تصور کو بے چوں و چرا قبول کر ہی لیا جائے۔اس لئے کہ آج کی تاریخ میں جو بھی تبدیلیاں زندگی اور ادب میں رونما ہو رہی ہیں وہ بیشتر نئے عہد کے زائدہ سیاسی وسماجی اور ثقافتی ومعاشی حالات کے زیر اثر ہی ہو رہی ہیں۔ وقت کے ساتھ سماج اور ثقافت، ادب اور شعریات میں تبدیلیوں کا رونما ہوتے رہنا ایک فطری عمل ہے۔اکیسویں صدی میں اردو ادب میں سوسئیر، رولاں بارتھ، ڈریڈا اور روسی ہیئت پسندوں کے لسانی وادبی تصورات پر بہت زور دیا جاتا رہا۔لیکن پھر بھی وقت کے ساتھ ان کا زور کم بھی ہوتا رہا ہے اور اردو شعروادب میں نئے لسانی اور تخلیقی رویئے سامنے آ رہے ہیں۔گوپی چند نارنگ نے بھی تخلیقی رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو فطری مانتے ہوئے بہت پہلے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

> ''کلیت پسندی، آمریت، یکسانیت اور ہم نظمی تخلیقیت کے دشمن ہیں۔تخلیقیت کو میکانیکی کلیت کا اسیر کرنا اس کی فطرت کا

خون کرنا ہے۔ تخلیقیت مائل بہ مرکز نہیں، مرکز گریز قوت رکھتی ہے۔ تخلیقیت آزادی کی زبان بولتی ہے۔ ہر متن بدلتی ہوئی ثقافتی توقعات کے محور پر پڑھا جاتا ہے۔ معنی خیزی کا لامتناہی ہونا تخلیقیت ہی کی شکل ہے۔ ہر سچی تخلیق پرانے نظام کو بدلتی ہے، اس لئے نئے نظام (شعریات) کی نقیب ہوتی ہے۔ تخلیقیت کسی ایک مقام پر رکتی نہیں، یہ ہر لحظہ تازہ اور ہر لحظہ تغیر آشنا ہوتی ہے۔ نئے عہد کی پیچیدگیاں، انسانی اقدار کا زوال، تیسری دنیا کا استحصال، پس ماندگی اور بے روزگاری ایسے بھیانک مسائل ہیں جو نئے اظہاری پیرایوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ے

(گوپی چند نارنگ۔ دیباچہ۔ نیا اردو افسانہ)

نکولس بوریو نے مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان کرتے ہوئے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ عالمی سطح پر مابعد جدیدیت یورپی مابعد جدیدیت کا چربہ ہے۔ اردو میں بھی ایک طبقہ ایسا ہی سمجھتا رہا ہے۔ مثلاً معتبر شاعر شہپر رسول نے بھی بہت پہلے کہا تھا:

جدید کیسے تھے، مابعد کے جدید ہیں کیا
کہاں کے بیج یہ کن مٹیوں میں بوتے ہیں

اردو میں اور بھی بہت سارے لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔ خاص طور پر ہندو پاک کی سماجی و ثقافتی تبدیلیاں مغربی ممالک کی تبدیلیوں سے مماثلت سے زیادہ افتراق کے رشتے رکھتی ہیں۔ اس لئے ہندو پاک کی مابعد جدید صورت حال مغربی ممالک کی مابعد جدید صورت حال سے کسی حد تک مماثلت رکھنے کے باوجود بڑی حد تک مختلف ہے۔ مغرب کی مابعد جدیدیت سماجی و ثقافتی زندگی کو اس کے کُل (Totality) میں اپنے اندر سمیٹتی رہی ہے۔ لیکن ہندو پاک میں مابعد جدید

ثقافتی حالات Post Modern Cultural Conditions نے شعر وادب سے قطع نظر، سماجی اور معاشی زندگی میں ابھی تک پھیلاؤ کے زیادہ مرحلے طے نہیں کئے ہیں کیونکہ گنتی کے چند بڑے (سلی کون) شہروں ممبئی، کولکاتا، چنئی اور لاہور، کراچی وغیرہ سے قطع نظر، ملک کا معاشرہ آج بھی تعمیر وترقی کے دعوؤں اور وعدوں کے باوجود، بحیثیت مجموعی برصغیر ہندو پاک میں معاشرہ، غربت وافلاس، بے روزگاری اور تعلیمی پسماندگی سے دوچار ہے۔ خداپرستی، انسان دوستی آج بھی برصغیر ہندو پاک کے لوگوں کی روح اور ضمیر کا حصہ ہیں۔ تدبیر کا گہرا شعور حاصل کر لینے کے باوجود تقدیر پر انحصار کا مزاج نہیں بدلا ہے۔ اس لئے اتنی بات تو طے ہے کہ مغرب کی مابعد جدیدیت (اور اس کی شعریات) کو ہندو پاک میں من وعن اور بعینہٖ منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے گوپی چند نارنگ نے بھی ابتدا میں ہی مابعد جدیدیت کے جبری انطباق کو غیر ضروری بتاتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اردو میں ہرگز ضروری نہیں کہ مابعد جدیدیت کی تبدیلیاں مغرب کا چربہ ہوں یا یورپ کی زبانوں کا ظل ثانی ہوں۔ اردو میں رویوں کی تبدیلی اردو کے اپنے مخصوص ادبی حالات اور تخلیقی ضروریات اور تہذیبی مزاج وافتاد کی زائیدہ ہوگی''۔

حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، وزیر آغا اور ناصر عباس نیر وغیرہ بھی اردو میں مابعد جدیدیت کو مغربی مابعد جدیدیت سے مختلف اور منفرد مانتے ہیں۔

ہندو پاک میں اکثر وبیشتر تخلیق کار اور ناقدین آج جس جدید سماج، ثقافت اور شعریات کے دیسی (Native) سیال، لچکدار اور آزاد کردار کی حمایت کرتے ہوئے جو باتیں کر رہے ہیں، ان سے نکولس بوریو کے مابعد جدیدیت کی موت اور

متبادل جدیدیت کا تصور یکسر رد ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی بوریو نے متبادل جدیدیت کی طرف داری میں جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اپنی اصل میں نئی مابعد جدیدیت اور 'نو مارکسیت' کے تصورات کا ہی حصہ ہیں کیونکہ ان میں مروّجہ مغربی سے زیادہ مقامی ثقافتی اور ادبی روایات واقدار سے رشتہ جوڑے رکھنے جذبات ملتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا اردو ادب بھی ایسے موضوعات اور اسالیب کے ساتھ سامنے آرہا ہے جن میں عالمی انسان کے تصور کے ساتھ ساتھ مقامی وعلاقائی ماحول ومعاشرہ کے مسائل اور معاملات کی ترجمانی بھی ہورہی ہے اردو ادب کا یہ منظرنامہ مغرب زدگی کے الزام کو بڑی حد تک غلط ثابت کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ متبادل جدیدیت کا مفروضہ سرمایہ داریت کے 'احیا' کی ایک کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ مارکسی مفکر فریڈرک جیمسن نے اپنی تصنیف The Post Modernism میں مابعد جدیدیت کو عالم انسانیت کی ایک تاریخی حقیقت مانا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرمایہ دار قوتوں کی سازشوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے اپنی تحریر Post Modernism or the Cultural Logic of Late Post Capitalism میں بہت پہلے کہا تھا کہ:

> ''نئی سرمایہ داریت کی ہمہ جہت سرگرمیوں نے جن میں ذرائع ابلاغ بھی شامل ہیں، عالمی پیمانے پر ایسے (منفی) سماجی وثقافتی حالات پیدا کئے جن کے ردعمل میں مابعد جدیدیت کا فروغ ہوا۔''

دراصل آج اکیسویں صدی میں عالمی سطح پر سماج، ثقافت اور ادب میں جو بھی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں ان میں ذرائع ابلاغ' (پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا) اور ترسیل اور وصولیابی کی مختلف سہولتوں کا اہم کردار ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ

عالمی سطح پر یہ ذرائع ابلاغ، جن کا ریموٹ کنٹرول سرمایہ دار صہیونی نسل پرست طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے، پوری دنیا میں اپنی مرضی کی سیاست اور حکومت معیشت اور ثقافت ہی نہیں اپنے مفاد اور مزاج کے موافق ادبی فضا (شعریات) کی تشکیل میں بھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ انسان اور انسانیت دشمن کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ اس تباہ کن سچائی کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ سرمایہ دار قوتوں نے 'سوویت روس' کو ہتھیاروں کے ذریعے نہیں، ذرائع ابلاغ کے سہارے ہی توڑا تھا۔ سوویت روس میں 'پرسترائکا' اور ''گلاس نوتس'' کی تحریکیں سرمایہ دار قوتوں کی ایما پر ہی شروع ہوئی تھیں۔ یہ قوتیں ایک طرف تو ریڈیو، ٹی۔وی اور اخبارات و رسائل کے ذریعے دنیا کو موج مستی اور فحاشی کی ترغیب دیتی رہتی ہیں اور دوسری طرف مختلف قوموں، فرقوں اور طبقوں کو مذہب، زبان، علاقہ اور تہذیب کے نام پر باہم جنگ و جدال میں مبتلا رکھنے کی سازشیں بھی کرتی رہتی ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے نام نہاد ترقی یافتہ اور مہذب ممالک پوری دنیا میں ایسے سماج اور تہذیب کی تشکیل اور فروغ چاہتے ہیں جس کا ایک رخ جنس پرستی اور عیش و عشرت کا ہو اور دوسرا جنگ و جدال کا۔ یہ قوتیں چاہتی ہیں کہ دنیا اور خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک یا تو آپس میں جنگ کرتے رہیں یا ان کے عوام زبان، علاقہ اور مذہب، مسلک/آستھا کے نام پر قتل، آتش زنی اور عصمت دری کرتے رہیں یا پھر ان کی نوجوان نسلیں مختلف طرح کے نشے کے عادی ہو کر ناچنے گانے اور داد عیش دینے میں مصروف رہیں۔

اردو میں بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے اوائل سے ہی ایسی تخلیقات بے شک سامنے آ رہی ہیں جنہیں دو اور دو چار کی طرح کسی مخصوص رجحان یا تحریک کے خانے میں رکھنا دشوار ہے اور جن میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رنگ بھی ہیں اور بہت کچھ ان سے الگ اور آگے کے فکری اکتسابات اور

تخلیقی رویّے بھی نمایاں ہیں۔ دراصل موجودہ دور کسی ایک واحد نظریۂ ادب کا نہیں بلکہ مختلف ،متضاد یا مشابہ نظریہ ہائے ادب کا دور ہے۔ لیکن پھر بھی آج کی ادبی تخلیقات (شاعری ہو یا نثر) بہر حال سابقہ لسانی وادبی رویوں اور پیرایوں سے جدلیاتی رشتے رکھتی ہیں۔ یہ شعر وادب کی نئی ارتقائی صورتیں ہیں لیکن انہیں لسانی و ادبی رویوں، رجحانات اور تحریکات سے صدفی صد لاتعلق کر کے کوئی اور نیا نام دے کر انہیں بے جڑ کے پودے نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اکیسویں صدی کے اردو ادب میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے جو خواص کسی بھی تناسب میں، بدلی ہوئی صورتوں میں موجود ہیں، ان کے سبب اردو ادب میں جو ایک نیا تخلیقی منظر نامہ ترتیب پا رہا ہے وہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے الگ ایک نئے نام کا تقاضہ بھی کر رہا ہے، اس حقیقت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل زندگی اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی بہت کچھ 'پرانا' ہو جاتا ہے اور 'نیا' ان کی جگہ لیتا رہتا ہے۔ اردو ادب میں یہ کیفیت آزادی/تقسیم ملک کے آس پاس سے ہی دو قومی نظریہ، فسادات، ہجرت کے حوالے سے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ برصغیر میں آزادی کی دلہن زخموں سے چور، بے آبرو ہو کر آئی تھی جس کا درد ہندوستان اور پاکستان کے عام لوگوں کی طرح شاعروں ادیبوں نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔ شب گزیدہ سحر کے داغ داغ اجالوں میں انسان اور انسانیت کی تذلیل کے حوالے سے منٹو، کرشن چندر، بیدیؔ ،عصمت چغتائی، سُہیل عظیم آبادی اور حیات اللہ انصاری سے لے کر قرۃ العین حیدر،، احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی ،عبداللہ حسین ، بلونت سنگھ، جیلانی بانو، جوگندر پال اور بانو قدسیہ کے فکشن میں ترقی پسندی ایک نئی جمالیاتی سج دھج کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور جدیدیت کے گلی کوچوں سے گزر کر اکیسویں صدی میں جوگندر پال، اقبال مجید عبدالصمد، حسین الحق، سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، انیس رفیع،

ترنم ریاض اور ذکیہ مشہدی سے لے کر انیس اشفاق، رحمٰن عباس، شبیر احمد، محسن خاں، اسلم جمشید پوری، احمد صغیر اور اسرار گاندھی تک کے ناولوں اور افسانوں تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح شاعری میں 1947ء کے آس پاس سے مجاز، فیض، مجروح، جذبی، اور سردار جعفری کے بعد مخدوم محی الدین، وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، سلیمان اریب، مظہر امام، قاضی سلیم، عمیق حنفی، باقی، شہریار وغیرہ کی جو شاعری سامنے آئی اس میں ''سیال ترقی پسندی'' کے پہلو بہ پہلو خوش رنگ کیف و جمال کے محاسن بھی ہیں۔ اردو شاعری کا یہی رنگ آگے چل کر اکیسویں صدی میں، کرشن کمار طور، عالم خورشید، رؤف خیر، پرتپال سنگھ بیتاب، خورشید اکبر، بلراج بخشی، ابراہیم اشک، فاروق نازکی، جمال اویسی، فرحت احساس، رفیق راز، شفق سوپوری، احمد شناس، مہتاب حیدر نقوی، شارق عدیل، سردار آصف، خالد بشیر احمد، عرفان عارف اور رغبت شمیم وغیرہ کی شاعری میں مخصوص نظریہ، رجحانات یا تحریکات سے ماورا اظہار و بیان کا جو آزاد لب و لہجہ نمایاں ہوا ہے وہ اردو میں ایک نئی شعریات کی تشکیل کی بشارت دے رہا ہے۔ چند غزلیہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں:

سر پہ یہ سایۂ دیوار کہاں رہتا ہے
دھوپ سے تنگ ہیں شاید جو یہاں بولتے ہیں

کرشن کمار طورؔ

☆

سوال یہ ہے کہ زخمِ جگر دکھاؤں کسے
ضمیر کس کا جھنجھوڑوں، یہاں جگاؤں کسے

ڈاکٹر رؤف خیرؔ

☆

اٹھائے سنگ کھڑے ہیں سبھی ثمر کے لئے
دعائے خیر بھی مانگے کوئی شجر کے لئے
عالم خورشید

☆

تمام شہر کو مسمار کر رہی ہے ہوا
میں دیکھتا ہوں وہ محفوظ کس مکان میں ہے
باقی

☆

گلاب ٹہنی سے ٹوٹا زمین پر نہ گرا
کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر تھے
شہریار

☆

اگر چٹان کی یہ چپ کلام ہے سائیں
تو پھر ہماری سماعت ہی خام ہے سائیں
بجا کہ شہر میں ارزاں بہت ہیں خواب مگر
یہاں تو نیند ہی ہم پر حرام ہے سائیں
رفیق راز

☆

ایسی تہذیب نظر آنے لگی بچوں میں
نظر آتے نہیں گلیوں میں کھلونے والے
بلراج بخشی

غیر کا خوف نہیں، عکسِ انا کا ڈر ہے
اس خرابے میں خود اپنی ہی صدا کا ڈر ہے
سلیم شہزاد

☆

بے طلب ہیں تو پھر انداز بدل کر دیکھیں
کبھی چہرہ کبھی آواز بدل کر دیکھیں
خورشید اکبر

☆

اس شہر میں کسی کو کسی کی خبر نہیں
ہر شخص جی رہا ہے بس اپنی اداؤں میں
پرتپال سنگھ بیتابؔ

☆

ستم وہ ڈھاتا ہے جب بھی کبھی غریبوں پر
امیر شہر کی آواز بیٹھ جاتی ہے
نہ ہو شعور اگر بادشاہ میں کوئی
تمام قوم ہی صدمے کئی اٹھاتی ہے
ابراہیم اشکؔ

☆

پہلے تو قتل پھر مرا ماتم کیا گیا
یوں زخم کو ہی زخم کا مرہم کیا گیا
شارق عدیلؔ

کئی طرح کے جوابات اک سوال میں ہیں
قبیلے والو، یہ آثار تو زوال کے ہیں
منان بجنوری

☆

دھمکیاں ملتی رہیں گی یوں ہی دنیا بھر سے
مصلحت جب کبھی سمجھوتہ کرے گی ڈر سے
دلشاد نظمی

☆

ایک میں ہوں اور دستک کتنے دروازوں پہ دوں
کتنی دہلیزوں پہ سجدہ ایک پیشانی کرے
مہتاب حیدر نقوی

☆

جانے کس مسجد کی صورت بن رہی ہے خواب میں
جانے کن سجدوں کی آہٹ میری پیشانی میں ہے
فرحت احساس

☆

خامی تجھی میں ہے کہ زمانہ خراب ہے
آخر سبھی کو تجھ سے یہ کیوں اجتناب ہے
راشد حسین راہی

☆

جس میں کچھ قبریں ہوں کچھ چہرے ہوں کچھ یادیں ہوں
کتنا دشوار ہے اس شہر سے ہجرت کرنا
لیاقت جعفری

ان شعرا سے پہلے اوپر جن اکیسویں صدی کے فکشن نگاروں کا ذکر ہوا ہے ان میں کوئی بھی سکہ بند ترقی پسند نہیں ،(پروفیسر صادق بہت پہلے جدید افسانہ نگاروں کے یہاں نئی ترقی پسندی کی نشان دہی کر چکے ہیں) اسی طرح جن شعرا مثلاً شہریار، کرشن کمار طور، باقی، رؤف خیر، عالم خورشید، بلراج بخشی، خورشید اکبر وغیرہ کے اشعار درج کئے گئے ہیں ان میں بھی کوئی عادل منصوری ، وہاب دانش، پرکاش فکری ، کمار پاشی وغیرہ کے جیسا 'جدید' نہیں۔لیکن ان فکشن نگاروں اور شاعروں کی تحریروں میں مابعد جدید سماج اور ثقافت کے عناصر ہیں، ساتھ ہی ان میں ترقی پسند مصنّفین کی ''بھیمڑی کانفرنس (منعقدہ۔مئی ۱۹۴۹ء) کی قرارداد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔۸

بحیثیت مجموعی ، اکیسویں صدی کے اردو فکشن نگاروں اور شاعروں کی تحریروں میں نہ تو کسی خاص نظریہ کو 'خضر راہ' بنایا گیا ہے اور نہ کوئی سابقہ تحریک یا رجحان' پیر تسمہ پا' کی حیثیت رکھتا ہے ، پھر بھی ان کی تحریروں میں ہر طرح کے استحصال اور قید و بند سے آزاد انسان اور انسانیت کے حوالے سے ایسا بہت کچھ ہے جس کے ڈانڈے ''نئی ترقی پسندی (نو مارکسیت) اور 'نئی مابعد جدیدیت' دونوں سے مل کر ایک نئے ادبی منظر نامہ کے خدوخال نمایاں کر رہے ہیں۔اسی کی بنا پر ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی کی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ

'' آج تیسری دنیا کا ادب ، جس میں برصغیر کا ادب بھی شامل ہے، دراصل حقیقی آزادی کا ادب ہے۔ یہ ادب استحصال سے پاک

سماج کے قیام کے لئے دیرپا ہتھیار کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔''

(محمد علی صدیقی۔ترقی پسند ادب: محرکات ورجحانات)

اور جیسا کہ ذکر ہوا ہے اردو میں مابعد جدیدیت کے بنیاد گزار نقاد گوپی چند نارنگ نے بھی شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ:

''مابعد جدیدیت ایک آزاد اور کھلا ڈلا ذہنی رویہ ہے۔ نئے عہد کی پیچیدگیاں، انسانی اقدار کا زوال، تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال، پس ماندگی، جہالت، اور بے روزگاری وغیرہ ایسے بھیانک مسائل ہیں جو نئے اظہاری پیرایوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی تاریخ تک آ کر اردو قلم کار ہی نہیں قارئین کا بھی ایک بڑا طبقہ، بقول ش۔ک۔نظام یہ مانتا ہے کہ'' اردو میں جدیدیت ایک بھولا ہوا حافظہ ہے''۔لیکن ساتھ ہی ایک طبقہ پرانی ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کو بھی ادب کے لئے پیچیدہ اور مسئلہ خیز Problematic گردانتا رہا ہے۔ناصر بغدادی جیسے کئی لوگوں کا یہ خیال ایک حد تک درست ہے کہ:

''مابعد جدیدیت پر یقین رکھنے والے کبھی متفق نہیں ہو سکے کہ

(۱) کیا چیز مابعد جدیدیت ہے؟ اور

(۲) کیا چیز مابعد جدیدیت نہیں ہے۔

چند ناقدین عالمانہ بے خبری میں اسے جدیدیت کی توسیع سمجھتے ہیں جو راقم کے نزدیک ایک تسامح ہے۔''[۹]

مابعد جدیدیت کے بارے میں ایسے سوالات اس لئے بھی سامنے آتے ہیں کہ یہ کوئی بندھا ٹکا نظریہ نہیں بلکہ نظریوں کو 'رد' کرنے والی ایک 'ثقافتی صورت حال' ہے جو کسی بھی نظریہ/نظام کو مستقل اور کافی نہیں سمجھتی بلکہ مابعد جدیدیت، سابقہ

نظریات کے انسان ، انسانیت ، زبان زندگی اور زمانہ سے متعلق مثبت پہلوؤں کو، ردوقبول کے مرحلوں سے گزار کر اپنے اندر سمیٹتی بھی ہے اور آزادانہ انہیں برتتی بھی ہے۔ بت شکنی اور آزادگی کی یہ صفات، سادہ نہیں پیچیدہ ہیں، اس لئے سادہ لوگوں کو مابعد جدیدیت کی ماہیت اور غرض و غایت سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور وہ مابعد جدیدیت کی بے دخلی اور مابعد جدیدیت کی موت Death of Post Modernism کا شگوفہ چھور کر اس کی جگہ اپنی مرضی Alter Modernism جیسے کسی نظریّے یا مفروضے کو ماحول معاشرہ اور ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی غرض 'گلوبلائزیشن' اور 'صارفیت' پر مبنی ایک ایسے کولونیل سماج کی تشکیل ہے جس کو میڈیا سوسائٹی یا تماشہ سوسائٹی (Spectical Society) کہتے ہیں۔ ایسے سماج میں اعلیٰ، متوسط اور نچلے طبقہ کے بیچ کی دوریوں میں اضافہ اور مسلمہ انسانی واخلاقی اقدار میں انتشار ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی لئے، نئی ترقی پسندی، مارکسی جمالیات کی نئی تعبیرات اور ٹیری ایگلٹن، جارج لوکاچ کی اضافی تشریحات کے علاوہ مابعد جدید دانشوروں، آلتھوسے، جیمسن اور الین ووڈ سے لے کر گائتری اسپائیواک، جولیا کرسٹیوا اور لنڈا ہوشین تک کے نظریات ایسے انسان اور انسانیت مخالف سماج، ثقافت اور شعریات کی مخالفت کرتے ہیں۔

اس صورت حال سے سماج میں انسانی حسیات، رویئے اور شعریات متاثر نہ ہوں اور اس کا اظہار شعر وادب میں نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اس صورت حال کے سارے 'وارْ' عام انسان (جن میں اردو کے ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں) ہی سہ رہا ہے۔ لیکن انسان جبر، جرائم، عصبیت اور استحصال سے مبرا ایک آزاد پرسکون اور انسان دوست Humanist ماحول، معاشرہ (دنیا) کی تشکیل کس طرح کرے؟ اکیسویں صدی میں سماج اور ثقافت کا بنیادی مسئلہ تو یہ ہے ہی ساتھ ہی یہ اردو

ادب کا ایک اہم تخلیقی وتنقیدی محرک بھی ہے اور چونکہ 'نو مارکسیت' (نئی ترقی پسندی) اور 'نئی مابعد جدیدیت' دونوں کا سروکار بھی اسی بنیادی سوال سے ہے، اس لئے شعوری یا لاشعوری طور پر ان دونوں ادبی نظریات کی لہریں، آج کے اردو ادب میں موجزن نظر آتی ہیں۔ ترقی پسندی ایک تحریک کے طور پر بھلے ہی کمزور ہوگئی ہو لیکن ایک ''طرز فکر'' کی حیثیت سے زندہ ہے۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ روایتی ترقی پسند اور مابعد جدید،، دونوں طرح کے ادب کی شناخت کا ایک حوالہ، بعض مخصوص الفاظ وتراکیب کا استعمال اور برتاؤ بھی ہے۔ مثلاً ''انسان، سرمایہ ومحنت، معاشرہ، طبقہ، نظام، جبر، استحصال ،مساوات، سماجی انقلاب، سیاسی آزادی، یکجہتی اور اجتماعی تعمیر وترقی جیسے الفاظ وتراکیب، ترقی پسند نظریئے کے تخلیقی و جمالیاتی اظہار و بیان میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید ادب نے ان کے استعمال سے پرہیز کیا اور ان کی جگہ، تنہائی، بے گانگی، بے سمتی، تشکیک، فردیت، یاسیت کا اظہار و بیان، سایہ، سمندر، تاریکی، شجر، پتھر اور ریت جیسے الفاظ کے استعاراتی وعلامتی برتاؤ کے ساتھ پیش کیا لیکن مابعد جدید ادب نے ترقی پسند ادب کی لفظیات، تراکیب واصطلاحات کو رد نہیں کیا بلکہ اکثر و بیشتر ترقی پسند ادب کے ان الفاظ وتراکیب کو جھاڑ پونچھ کر ادب میں اپنے طور پر استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اسی طرح مابعد جدیدیت کے چند ایک مخصوص شناختی لسانی وظیفے ہیں مثلاً شگاف (Hole) التوائیت (Differentiation) ادعائیت Dogmatism تکثیریت (Pluralism) مہا بیانیہ (Grand Narration) دوسرا پن (The Other) لانگ، پیرول، دال (Signifier) مدلول ،ذہنی ساخت StructureMind) جمالیاتی مسرت (AestheticPleasure) اور اجنبیت، عدم مانوسیت (Defamiliarisation) وغیرہ اور نو مارکسی (ترقی پسند)

مفکرین ادیب اور دانشور بھی مابعد جدیدیت کی ا ن تر اکیب اوراصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔

معاصر اردو تنقید میں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، وزیر آغا، فہیم اعظمی کے بعد کے ناقدین عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، ارتضٰی کریم، خالد حسین قادری، ناصر عباس نیر اور شافع قدوائی وغیرہ اوران کے بعد کی نسل کے کوثر مظہری، شہاب ظفر اعظمی، رغبت شمیم ملک، الطاف انجم اور ریاض توحیدی وغیرہ ان الفاظ اور اصطلاحات کو معاصر ادب و ثقافت کے شناختی امتیازات کی توضیح وتعبیر کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔اسی طرح معاصر شاعری میں، شہریار عرفان صدیقی اور اسعد بدایونی، ارمان نجمی اور عبدالاحد ساز کے بعد عالم خورشید، روف خیر، شہپر رسول، فرحت احساس، راشد انور راشد، شفق سوپوری، خورشید اکبر، مہتاب حیدر نقوی اور خالد عبادی وغیرہ شاعروں کے علاوہ فکشن میں اقبال مجید، پیغام آفاقی، ساجد رشید، مشرف عالم ذوقی، حسین الحق، عبدالصمد، ترنم ریاض اور شوکت حیات کے معاصرین سلام بن رزاق، انیس رفیع، ذکیہ مشہدی، اسلم جمشید پوری، شائستہ فاخری، احمد صغیر، صادقہ نواب سحر، نورالحسنین، بشیر ملیر کوٹلوی، مشتاق مہدی اور اسرار گاندھی وغیرہ کے یہاں 'لاشعوری' طور پر ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کے امتیازات ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں اوراس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تیسری دنیا (ہندوستان پاکستان) کو تشویشناک بحرانی دور کا سامنا ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عظیم رہنماؤں کی طرح عظیم ادیب اور ادب بھی بحرانی دور میں ہی پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا انسان اور ادب کی بقاوارتقا کیلئے لازم ہے کہ'' آلٹر ماڈرنزم، Alter Modernism' کلچرل نیشنلزم'، 'فاشزم' اور' کمیونلزم جیسے انسان دشمن منفی رجحانات پر کان دھرنے کے بجائے ''سوشلزم'' اور'' ہیومنزم'' کی روایات

واقدار کے حوالے سے ترقی پسندی (مارکسیت)اور مابعد جدیدیت کی زائیدہ نئی سماجی، ثقافتی اورادبی لہروں کوایک نظریاتی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

نو مارکسی نقاد ٹیری ایگلٹن، جارج لوکاچ، اور مابعد جدید دانشور آلتھو سے اور میکس ویبر وغیرہ بھی یہ مانتے ہیں کہ ترقی پسندی کی طرح مابعد جدیدیت کا مقصد بھی بنی نوع انسان کے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اردوادب میں بھی ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحات یا الفاظ کی معنیاتی تکثیریت اورتہہ داری نہ صرف زیادہ نمایاں ہورہی ہیں بلکہ نظریاتی زاویئے سے بھی ایک دوسرے میں ضم بھی ہورہی ہیں۔لیکن یہ بات بھی یادرکھنے کی ہے کہ ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت دونوں میں ردوقبول کا فطری عمل بھی جاری ہے۔دونوں میں 'بدلاؤ' آیا ہے۔معتبر ترقی پسند نقاداور فکشن نگار پروفیسرش۔اختر نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسند تنقید'' میں لکھا ہے:

> ''آج کی ترقی پسندی سجاد ظہیر کے عہد سے مختلف ہے۔ یہ تبدیلی بالکل فطری ہے اس لئے ناقدین اور تخلیق کاروں کے رویوں میں جوتغیر نظر آتا ہے، وہ کسی حیرت واستعجاب کوجنم نہیں دیتا۔ گزشتہ تیس برسوں میں خودسوشلسٹ ملکوں میں حیرت انگیز انقلابات آئے ہیں۔لیکن اس سے بھی اہم واقعہ سائنس کی اس صدی میں بنیاد پرستوں Fundamentalists کی مختلف تحریکیں ہیں۔ پہلے ان کا ایک حلقہ ہوا کرتا تھا، اب وہ مختلف سیاسی پارٹیوں، ادبی انجمنوں اور مذہبی جماعتوں میں شامل ہوگئے ہیں''۔[۱۰]

اسی طرح مابعد جدیدیت بھی آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آکرسو

فیصد وہ نہیں رہی جو بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں تھی اور جسے گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں سوسئیر، رولاں بارتھ اور ڈریڈا وغیرہ کے حوالے سے مشتہر کیا تھا۔

آج کی تاریخ میں امریکہ، روس اور چین کی حکمت عملی کے سبب، مشرق وسطیٰ اور (افغانستان سمیت) برِصغیر ہند و پاک کے سیاسی و سماجی اور ثقافتی و مذہبی خلفشار سے مبینہ طور پر جو فضا قائم ہوئی ہے اس کے اثرات قلم کاروں کی تخلیقیت پر بھی مرتب ہوئے ہیں اور مراٹھی، بنگلہ اور ہندی کے علاوہ اردو میں بھی شعوری یا لاشعوری طور پر ایسی شعری اور نثری تخلیقات سامنے آ رہی ہیں، جنہیں عام معنوں میں روایتی ترقی پسندی یا مابعد جدید ادب نہیں گردانا جا سکتا۔ کیونکہ آج کا اردو شعر و ادب، مخدوش حالات اور تازہ ترین فکریات، زبان، لب و لہجہ اور طرز بیان کے اعتبار سے بڑی حد تک سردار جعفری کی ترقی پسندی اور پرانی (نارنگ برانڈ) مابعد جدیدیت سے بھی کنی کاٹ کر، ایک ایسے نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے جسے اپنی ملکی زندگی، زمین اور زمانہ سے وابستہ Subaltern یا ''دیسی یا Native ادب کہنا بھی غلط نہیں ہوگا۔ 'دلت اور مسلم اقلیت اساس ادب کے حوالے سے اس 'دیسی واد کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اس کا مزاج، نارنگ برانڈ مابعد جدیدیت کے موافق سے زیادہ مخالف ہے۔ واقعتاً آج کے اردو ادب میں عصری مسائل کے حوالے سے جو مقامیت، ارضیت غالب ہے اسے ''دیسی واد' Nativism تو کہہ سکتے ہیں لیکن پورے طور پر، 'سکہ بند مابعد جدیدیت کی آئیڈیالوجیکل ترجیحات سے اس کا رشتہ رسمی اور شرماشرمی کا ہی کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اکیسویں صدی میں پیغام آفاقی، عبدالصمد، غضنفر، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، ذکیہ مشہدی، نورالحسنین، انیس اشفاق، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری، شموئل

احمد، احمد صغیر، ثروت خان، اور افسانہ خاتون سے لے کر شبیر احمد اور محسن خاں تک کے ناولوں اور افسانوں میں اور آج کے شاعروں ساقی فاروقی ، منیر نیازی، رؤف خیر، بانی، کرشن کمار طور، عالم خورشید، فرحت احساس بلراج بخشی اور خورشید اکبر وغیرہ کے یہاں، اور باتوں کے علاوہ ہندوستان کے دیہی اور شہری ماحول معاشرہ کے ہمہ جہت مسائل کے بیان کے حوالے سے ،'مقامیت ،ارضیت یعنی ''دیسی پن'' Nativism بھی ہے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ، مختلف ومتضاد سماجی وسیاسی اور تہذیبی واقتصادی اسباب وعلل کی بنا پر آج کا اردو ادب، ''اشتراکی شدت پسندی'' اور پیچیدہ فلسفہ زدہ مابعد جدیدیت سے رشتہ رکھنے کے باوجود ان سے الگ ایسا ادب ہے جس میں انسان اور انسانیت سے متعلق عالمی نظریات کی اثر آفرینی کے باوجود فطری ارضیت اور 'دیسی پن Nativeness کی مہک بھی ہے۔ ہر طرح کے استحصال ،تعصب اور کٹر پن کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ ایجاد واختراع کی انگڑائیاں بھی ، زبان کے لسانی برتاؤ کی تازہ کاری بھی اور اظہار وبیان کے نئے تیور اور پیرائے بھی۔

یہ سارے امتیازات اکیسویں صدی کی 'سماجی وثقافتی علمیات، فکریات اور معاشی سے لے کر مذہبی مسائل تک کے حوالے سے اکیسویں صدی کے اردو شعر و ادب میں تازہ ترین تخلیقی و جمالیاتی محاسن کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ خارجی حالات انسان کے ذہنی تغیرات کا سبب بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ان تغیرات کے پیش نظر شعر و ادب کو عصری زندگی اور زمانہ کے موافق سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن جب معاملہ زبان، زندگی، ملک اور ماحول کے تحفظ اور بقا کا ہو تو ادب اور ادیبوں کو سامنے آنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ سچا اور جینوین ادب ہمیشہ سیاست، سماج اور ثقافت سے آگے کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ آج کے اردو

ادب کے لئے یہ راستہ ''نئی ترقی پسندی'' اور ''نئی مابعد جدیدیت'' کے امتزاج کے زائیدہ نئے لسانی، جمالیاتی، فکری اور بیانیاتی 'رویوں' سے ہموار ہوتا نظر آتا ہے۔ اسے ہم ''نئی ترقی پسند مابعد جدیدیت'' ''مارکسی مابعد جدیدیت'' یا پھر ''مابعد جدید مارکسیت'' کا نام دینے پر غور کر سکتے ہیں۔'انسان کی موت، ادب کی موت یا پھر 'مابعد جدیدیت کی موت' کا 'اعلان محض' راہِ فرار ہے جو ادب کو کعبہ نہیں، تُرکستان لے جائے گا۔ موجودہ انسان کی عظمت اور وقار کو ہر حال میں زندہ رکھنا ادب کا منصبِ اصلی ہے۔ اس لئے حالات کتنے ہی دھماکہ خیز کیوں نہ ہوں کوئی بھی جینوین ادیب وفنکار انسانی فطرت اور سماجی وثقافتی تقاضوں سے منہ موڑ کر ادب وفن کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ غالبؔ کے بقول:

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

☆☆☆

حواشی

۱۔ گوپی چند نارنگ؛ ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص۲

۲۔ ہماری ادبی صورت حال، شب خون

۳۔ دیباچہ۔ نیا اردو افسانہ

۴۔ جدیدیت کے بعد، گوپی چند نارنگ، ص۳۳

۵۔ دیباچہ. نیا اردو افسانہ، ص۲

۶۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ندیم احمد، ص۱۳۲

۷۔ جدیدیت کے بعد، گوپی چند نارنگ

۸۔ ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر۔ مرتبہ قمر رئیس۔ .عاشور کاظمی۔ ص۔۶۷

۹۔ ''امروز'' ابوالکلام قاسمی نمبر اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۱ء، ۴۸

۱۰۔ نئی ترقی پسند تنقید، پروفیسر ش۔ اختر، ص۶۰، ہم لوگ پبلی کیشنز، رانچی ۲۰۱۵

☆☆☆

☆.....پروفیسر ناصر عباس نیئر

ادبی متون کو کیسے پڑھیں؟

انسانی متون کیسے پڑھے جائیں؟ اس سوال کی سیاسی جہت واضح ہے۔ قاری کو حق حاصل ہے کہ وہ کیا پڑھے اور کیسے پڑھے۔ قاری سے مراد ایک بالغ نظر شخص ہے جو دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنے میں یقین رکھتا ہے اور اپنی نظر کو معتبر بھی جانتا ہے۔ جب ہم اس بالغ نظر شخص کو یہ بتانے کی کوشش کریں کہ وہ فلاں کتاب پڑھے اور اس کے لیے ایک مخصوص طریقہ اختیار کرے تو گویا ہم اس دنیا میں قدم رکھتے ہیں جسے ''معنی کی سیاست'' کہنا چاہیے۔ کئی کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو اہم سمجھنا، در اصل اس کتاب کے معنی کو سماجی دنیا میں ترجیحی مقام دینے یا کم از کم اسے قابل قبول بنانے کی سعی ہے۔ نیز قاری کے سوچنے کے لیے ایک حد مقرر کرنا ہے۔ ہم قاری کی بالغ نظری سے لے کر اس کے انتخاب کے حق اور فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کہنے میں بھی ہمیں عار نہیں کہ مصنف سے جدا ہونے کے بعد متن سراسر قاری پر منحصر ہوتا ہے۔ قاری کے بغیر متن ''موجود'' ہوسکتا ہے مگر متن کی زندگی یعنی اس میں معنی کا حرکت کرنا اور اندر اور باہر کی دنیاؤں سے منسلک ہونا، صرف قاری کی مرہون ہے۔ جو متن اپنے پڑھنے والوں سے محروم ہوجائے، اس کے ''زندہ درگور'' ہونے میں شک نہیں۔ ہم یہاں چند بنیادی باتوں کا اعادہ چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پڑھنا اکتسابی عمل ہے۔ ہر قاری اوّل اوّل اسے سیکھتا ہے۔ جب ایک شخص یہ بنیادی بات بھول جائے، اس کی پڑھنے

کی آزادی حقیقت میں خطرے کی زد پر آجاتی ہے۔ پڑھنے کے اساسی عمل کو یاد کرنا، ایک طرف اسے خودکار ہونے سے بچاتا ہے، دوسری طرف قاری کے مطالعۂ متن کے اس حق کی حفاظت کرتا ہے جو اسے بہ طور قاری حاصل ہے اور جس میں مداخلت کا اختیار کسی کو نہیں۔ یوں بھی کسی متن کا قاری ہونا ایک ایسے نجی منطقے کو خلق کرنا ہے جہاں متن اور قاری ایک دوسرے سے راز و نیاز کرتے ہیں۔ اگر کوئی تیسرا ان کے راز و نیاز میں کوئی سرگوشی کرسکتا ہے تو وہ زیر مطالعہ متن کی ثقافتی علامتیں ہیں یا قاری کی شخصی یادداشتیں۔

پڑھنا اکتسابی عمل ہے، مگر کثرت سے دہرائے جانے کے سبب، یہ اکتسابی محسوس نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت کہ متون کو پڑھنے کے لیے اوّل اوّل سخت محنت کی گئی تھی، محض اس لیے ذہن سے محو ہوجاتی ہے کہ آدمی مسلسل پڑھتا رہتا ہے۔ جیسے دوڑتے ہوئے یاد نہیں رہتا کہ کبھی محض انھی دو پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے خاصی مشق کرنا پڑی تھی۔ اس حقیقت کا محو ہوجانا، پڑھنے کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ جب پڑھنے کا عمل خودکار محسوس ہونے لگے تو سمجھئے، پڑھنے کا عمل سرے سے واقع ہی نہیں ہورہا۔ آدمی کے اندر کوئی لرزش بپا ہورہی ہے نہ متن کی دنیا کا کوئی سربستہ حصہ اپنا انکشاف کررہا ہے نہ دونوں میں ایک دوسرے سے راز و نیاز کی کیفیت پیدا ہورہی ہے اور نہ حقیقی دنیا کو نئے سرے سے دیکھنے، نئی سطح سے سمجھنے اور سابق تصورات پر نظر ثانی کا احساس پیدا ہونے کا وہ کمیاب لمحہ رونما ہورہا ہے، جو کسی متن کے پڑھنے کا انعام ہے اور جس کے بغیر صفحوں کے صفحے کھنگالنا محض مشقت ہے۔

پڑھنا ہے کیا؟ پڑھنا، ایک 'مکمل سرگرمی' ہے۔ مکمل سرگرمی ہستی کی مکمل سپردگی (بہ شرط ہوشیاری) کا تقاضا کرتی ہے۔ گویا یہ بہ یک وقت ذہنی واحساسی اور نجی وسماجی ہے۔ عام حالت میں آدمی کی ہستی منقسم رہتی ہے۔ تقسیم بے گانگی، علاحدگی اور

خود پسندی کو جنم دیتی ہے۔ ہماری عمومی حالت ان اندھوں کی سی ہوتی ہے جو ہاتھی کو چھو کر بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پورے ہاتھی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ پڑھنے کی سرگرمی ہستی کے منتشر حصوں کو یکجا کرنے کا امکان رکھتی ہے۔ ہم نے ہستی کی جس تقسیم کا ذکر کیا ہے، یہ ہم سب کی تقدیر ہے۔ ہم سب کی ذہنی نشوونما ماں اور فطرت سے اوّلین وحدت کے ٹوٹنے کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ یہ تقسیم زبان سیکھنے کے بعد مزید گہری ہو جاتی ہے۔ ثقافتی علامتوں کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد یہ تقسیم بڑھتی جاتی ہے۔ ہم جذباتی طور پر پہلے فطرت اور ماں سے جدا ہوتے ہیں، پھر خود سے۔ اردگرد سے جذباتی انقطاع کے بعد ہمارے محسوسات اور خیالات میں ثنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم بہترین خیالات کے ساتھ بدترین محسوسات کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا تجربہ ہم کسی ایک چیز، ایک فرد، دنیا، کائنات اور خود اپنے لیے بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی چیز، ایک ہی آدمی، ایک ہی کتاب، ایک ہی رشتے کے سلسلے میں ہمارے خیالات و احساسات شاید ہی یکساں رہتے ہوں۔ ایک وقت کی محبوب ترین ہستیاں اور کتابیں ہمارا جہنم بن سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کل کا جہنم آج ہمارے لیے فردوس صورت ہو۔ یہ دوجذبیت ہماری شخصیت کا مستقل حصہ بنی رہتی ہے۔ غالب کا شعر آدمی کی اسی وجودی حالت کو بیان کرتا ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بے دماغی، نفسیات اور فلسفے کی اصطلاح بن سکتی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں ''دماغ'' تفکر، میلان، توجہ، رغبت کے مطالب لیے ہوئے ہے۔ بے دماغی کی حالت، فکر اور رغبت دونوں کے ترک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں ہلکا سا طنز اور تفاخر بھی شامل ہے۔ یعنی بے دماغی مریضانہ رویہ نہیں۔ اپنی اصل حالت کو

قدرے تفاخر کے ساتھ قبول کرنے کا رویہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سماج، آدمی کی اس بے دماغی کا ادراک رکھتا ہے۔ تاہم جس طرح آدمی کے یہاں خود پسندی ہے، سماج کے یہاں بھی ہے (اس کا آغاز آدمی سے ہوتا ہے یا سماج سے، اس پر الگ سے بحث کی ضرورت ہے)۔ وہ آدمی کی اس بے دماغی یا دو جذبی میلان کو ختم کرنے کے لیے کہانیاں وضع کرتا ہے۔ بچے کو ماں اور فطرت کی طرف واپس لانے کی کہانیاں خود مائیں یا دوسری بزرگ عورتیں بیان کرتی ہیں۔ پھر یہ منصب سماج سنبھالتا ہے۔ بعد میں ریاست اور اس کے تعلیمی، مذہبی، ثقافتی ادارے۔ لیکن سماج اور ریاست کی کوششوں کے باوجود آدمی کی بے دماغی یا اس کی ہستی میں موجود تقسیم نہ تو کم ہوسکتی ہے، نہ ختم۔ البتہ وقتی طور پر معطل ہوسکتی ہے۔ اسے ارادی طور پر فراموش بھی کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ لوگ سماج اور ریاست کی کہانیوں پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ ان کی خاطر جان بھی دے دیتے ہیں اور انھی کے سبب قتل عام شروع کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں صورتیں، آدمی کی ہستی کی تقسیم کے خاتمے کی نہیں، اس کے گہرے ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ اندر سے بری طرح منتشر و منقسم اور نفرت سے لبریز شخص ہی خود کی یا دوسروں کی جان لے سکتا ہے۔

قدیم دور کی اساطیری رسوم نیز مذہبی و روحانی تجربات بھی مذکورہ دوئی کے خاتمے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ولیم جیمز کی Varieties of Religious Experience اس موضوع پر اچھی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم نے ''نفسیاتِ واردات روحانی'' کے نام سے کیا ہے۔ اس میں مغربی دنیا کے بزرگوں کے روحانی تجربات کا بیان ہے۔ متعدد مسلمان صوفیہ کی کتب میں بھی اس طرح کے تجربات کا بیان ہے۔ کتاب اللمع فی التصوف، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب وغیرہ۔ ان میں ''تذکرہ غوثیہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہماری نظر میں ''پڑھنا'' ایک ایسی مکمل

سرگرمی ہے جوانسان کے وجود کی دوئی اور دیگر رخنوں کے سلسلے میں کارآمد ہے۔

'مکمل سرگرمی' کا مطلب ہے کہ مذکورہ دو جذبی میلان یا بے دماغی، خواہ وقتی طور پر ہی سہی، باقی نہ رہے۔ جب ''پڑھنا'' ایک مکمل سرگرمی بننے میں کامیاب ہوتا ہے تو ہم ''وحدت'' کا تجربہ کرتے ہیں۔ جس اوّلین وحدت کی یاد ہمیں اکثر آتی ہے اور جو ہمیں محبت سے لے کر خدا، قوم پرستی، جنگلوں، صحراؤں میں لیے پھرتی ہے، اس سے مماثل وحدت کا تجربہ ہم پڑھنے کے دوران کرتے ہیں۔ اوّلین وحدت اپنی ماں اور فطرت سے تو کبھی نہیں لوٹ سکتی۔ آدمی اس جنت میں واپس نہیں جاسکتا، جسے اس نے چھوڑ دیا یا جہاں سے اسے نکال دیا گیا۔ آپ شعور یا زیادہ صحیح لفظوں میں آشوب آگہی سے گزرنے کے بعد قبل شعور کی حالت میں نہیں جاسکتے، خواہ آپ کے اندر واپس جانے کی آرزو کتنی ہی شدید اور سچی ہو۔ آدمی کو جنت گم گشتہ ملتی ہے اور نہ قوموں کو عظمت رفتہ۔ ہاں کسی نئی جنت اور نئی عظمت کا امکان ہوسکتا ہے۔ منیر نیازی نے اس کی ایک سطح بیان کی ہے:

واپس نہ جا وہاں کہ تیرے شہر میں منیرؔ
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پہ نہیں رہا

لیکن اس سے ملتی جلتی وحدت کا مختلف انداز میں تجربہ (پڑھنے کے ذریعے) نہ صرف ہم کرسکتے ہیں بلکہ وہ ہماری نجات کے لیے ازبس ضروری ہے۔ سیاسی، نفسیاتی اور روحانی نجات۔

پڑھنے کے عمل کے تین مراحل ہیں۔ آغاز ایک دنیا سے رخصت ہے۔ اس کا وسط دوسری دنیا میں داخل ہونا ہے اور انجام دونوں دنیاؤں کو معرض استفہام میں لانا ہے۔ جیسے ہی آپ پڑھنا شروع کرتے ہیں، جانی پہچانی، معمول کی دنیا سے رخصت ہوکر آپ کسی اور کی ساختہ دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ رخصت ہونا اور داخل

ہونا.....اگر اپنی تمام تر نفسی حالت کے ساتھ رونما نہ ہوں تو پڑھنے کا عمل واقع نہیں ہوتا۔آپ محض صفحے پلٹتے ہیں، جماہی لیتے ہیں اور کتاب ایک طرف پھینک کر سیل فون یا کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ رخصت ہونے کا مطلب، چھوڑنا، علاحدگی اور فراموشی ہے، جب کہ داخل ہونے کا مطلب ایک عالم حیرت کے ساتھ قبولیت اور نیم باز آنکھوں کے ساتھ سپردگی ہے۔ اگر چھوڑی ہوئی جگہ، یا وہ حالت جس سے آپ علاحدہ ہوئے ہیں، وہ آپ کی یادداشت میں پوری طرح جگہ بنائے ہوئے ہوں، آپ مڑ مڑ کر دیکھتے ہوں، ٹھوکر کھاتے ہوں تو اسے رخصت نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ایک دنیا سے رخصت مکمل نہیں تو نئی دنیا میں داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص اپنی معمول کی دنیا (اس میں انا کو بھی شامل کر لیجیے) کو معطل اور ترک کرسکتا ہے، وہی خود کو کسی اور کے سپرد کرسکتا ہے۔نشان خاطر رہے کہ سپردگی کا تجربہ سرشاری کا ہے۔

کسی تحریر کو پڑھنے کی سرگرمی کا عروج، وہ حالت ہے جب آپ خود کو کسی اور کی تحریر کے سپرد کر دیتے ہیں، اس تحریر کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اسرار کی بارش آپ پر برسائے، مگر ایک رو مسلسل رواں رہنی چاہیے جو یاد دلاتی رہے کہ آپ ایک انسان ساختہ متن میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اسے بریخت نے ''بے گانگی کا اثر'' یعنی Alienation effect کہا تھا۔اس نے یہ اصطلاح ڈرامے کے لیے استعمال کی تھی۔اس کا مقصود ایک ایسی تکنیک تھی جو ناظر کو تھیٹر کے مصنوعی ہونے کی حقیقت یاد دلاتی رہے۔ مابعد جدید فکشن میں بھی اسی سے ملتا جلتا اہتمام کیا جاتا ہے۔قاری کو برابر یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص فرضی کردار کی زبانی قصہ سن رہا ہے۔اگر مذکورہ رَو کا سرا، سپردگی کے دوران ہاتھ سے کھو جائے تو آپ سرشاری یا پڑھنے کا کیف تو حاصل کریں گے، مگر کچھ کھو بھی دیں گے۔(اور یہ ''کچھ'' معمولی نہیں ہے)۔ وصل

بھی دوطرفہ کیف کا تجربہ ہے۔ اگر یک طرفہ ہوتو اس میں سادیت یا مساکیت سے ملنے والی منفی سرشاری ہوتی ہے۔ کچھ یہی صورت متن کے مطالعے میں بھی دہرائی جاسکتی ہے۔ جولوگ متن سے محض سرشاری حاصل کرنے کو اپنے مطالعاتی سرگرمی کی معراج خیال کرتے ہیں، ان کی شخصیت میں مساکیت کا میلان ہوسکتا ہے۔ یعنی تشدد آمیز سرشاری حاصل کرنے کا میلان۔ آدمی کے تشدد کو بھلایا جاسکتا ہے، مگر متن کا تشدد ذہن ودل میں دورتک پہنچتا ہے اور آدمی کے تصور دنیا پر شدت سے اثرانداز ہوسکتا ہے۔ آدمی متن میں ظاہر کیے گئے تصور دنیا کو چپ چاپ، خوشی کے ساتھ جذب کرلیتا ہے اور پھر دنیا سے وہ خود، آزادانہ معاملہ نہیں کرتا، اس متن کا معنی اس کے ذہن ودل میں مقتدر حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ نیز مساکیت سے ملنے والی تشدد آمیز مسرت اس کی شخصیت کا مستقل حصہ بننے کا امکان رکھتی ہے۔ بیدی کے ''لاجونتی'' کی لاجو کی مانند۔ وہ سندرلال کے ستم سہہ کر جو خوشی محسوس کرتی ہے، اسی میں اپنے ہونے کا مفہوم پاتی ہے۔ فسادات میں تقدیر اسے کسی اور کے پاس لے جاتی ہے۔ واپس آتی ہے تو سندرلال اس سے نرمی سے پیش آتا ہے۔ اسے لگتا ہے، اس کے ہونے کا مفہوم باقی نہیں رہا۔

بریخت یہ ذمہ داری مصنف پر ڈالتا ہے کہ وہ ناظر (قاری) کو خبردار رکھے۔ مصنف اپنی تحریر میں ''اجنبیت'' کا احساس پیدا کرے تاکہ قاری سوال اٹھائے کہ کون سا کردار کس طور سماج کی سچائی کی نمائندگی کرتا ہے۔ مابعد جدید فکشن بھی قاری کو ہوشیار رکھنے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ فکشن اور حقیقت کے پیچیدہ تعلق کو سمجھ سکے؛ فکشن کا ہر کردار ایک اختراع ہے اور اس کے ذریعے پیش کی جانے والی دنیا بھی اختراع ہے۔ ایسا ادب قاری کو ہوشیار رکھنے کی سعی کرتا ہے۔ اردو میں مرزا اطہر بیگ نے ایسا فکشن تخلیق کیا ہے۔ مقبول عام ادب اس کے برعکس اہتمام کرتا ہے۔ وہ ''فکشن'' ہی کو حتمی سچ سمجھنے کا دھوکہ پیدا کرتا ہے۔

سپردگی میں ہوشیاری، متن کے مطالعے کا اساسی اصول کہا جاسکتا ہے۔ تاہم ایک دوسری انتہا بھی ممکن ہے۔ کچھ لوگ سرے سے سپردگی کا تجربہ ہی نہیں کرتے۔ متن کا مطالعہ کرتے ہوئے، وہ فقط ہوشیاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ حسیات پر ادراک کو، وجدان پر تعقل کو ترجیح دیتے ہیں۔ چناں چہ یہ لوگ خود کو متن کے سپرد کرنے سے زیادہ، اس پر حاکم ہونا پسند کرتے ہیں۔ انھیں غالباً خوف ہوتا ہے کہ کسی اور کا ساختہ متن انھیں نگل لے گا۔ وہ پسپا ہوجائیں گے۔ وہ اگر حقیقت میں بالشتیے ہیں تو وہ خود کو ننگی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ لوگ اس لمحے کو رونما ہی نہیں ہونے دیتے جہاں متن اپنی حسیات سے چنگاریاں پیدا کرتا ہے اور جو قاری کی حسی دنیا میں ہلچل سی پیدا کرتی ہیں۔ اوّل ان کا سروکار متن کے محض معانی سے ہوتا ہے، دوم وہ متن کے معنی 'دریافت' نہیں کرتے بلکہ استبدادی انداز میں متن کے معانی 'متعین' کرتے ہیں۔ نفسی طور پر یہ لوگ سادیت پسند ہوتے ہیں؛ انھیں متن کو مسخ کرکے، متن پر تشدد کرکے مسرت ملتی ہے۔ متن کو خود بولنے کا موقع دیئے بغیر یعنی متن کے بارے میں متن ہی سے، اس کے اصلی سیاق کے ساتھ حوالہ لائے بغیر اس کی نمائندگی تحکم کے ساتھ خود کرنا متن پر تشدد ہے۔ تحکم ہی تشدد کی زبان ہے۔ وہ اپنے نگلے جانے کے خوف کا اظہار، دوسروں کو متشددانہ انداز میں نگل لینے کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ بات ان کی نظر سے اوجھل رہتی ہے کہ متن کے معانی دریافت کرنے کے لیے، حاکمانہ طرز عمل نہیں، وہ انکسار چاہیے جو ایک طرف حقیقی جستجو کا پیدا کردہ ہے اور دوسری طرف اپنی انا کو جھکانے اور متن کے آگے تسلیم بجالینے کا زائیدہ ہے۔ جب کہ ان لوگوں کی انا اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہ اس امکان ہی کو رد کرتی ہے کہ معنی کا کوئی دوسرا سرچشمہ ہوسکتا ہے۔

یہ ایک عجیب وغریب حقیقت ہے کہ حاکمیت کا جذبہ انسانوں سے زیادہ متون پر حاوی ہونا پسند کرتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ انسان حاکمیت کو للکارتے ہیں یا

للکار سکتے ہیں اور متون اپنے مسخ کیے جانے کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکتے۔ دوم اس لیے کہ انسان جو کچھ جانتے ہیں اور سیکھتے ہیں ان کا سرچشمہ متون ہوتے ہیں، لہٰذا اگر متون کے من مانے معانی متعین کر دیئے جائیں تو ان کی مدد سے ان سب ذہنوں کو بھی قابو میں کیا جا سکتا ہے، جو یہ متون پڑھتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو انسانوں کے درمیان حقیقی کش مکش کی رزم گاہ کوئی نہ کوئی متن ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی متن کے استبدادی انداز میں معنی متعین کرتا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی اور متن پر انحصار کر رہا ہوتا ہے، جو تحریری بھی ہو سکتا ہے اور زبانی بھی۔ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی متن ہو۔ وہ متون کا ایک نظام بھی ہو سکتا ہے، جو ایک مشترک تصور کائنات میں شریک تصور کئے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں متون کی کش مکش دراصل تصور ہائے دنیا کی کش مکش ہوتی ہے، اور متون کو اس لیے رزم گاہ نہیں بناتی کہ متون حقیقی دنیا کی کامل وفاداری کے ساتھ ترجمانی کرتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ متون چیزوں، تصورات اور بیانیوں کو مستقل طور پر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں استبدادی انداز میں متن کے معنی متعین کرنے والا قاری کسی پرانے متن پر جو انحصار کرتا ہے، اس کی بنیاد متن کی اس سچائی کو پیش کرنے کی صلاحیت پر یقین ہوتا ہے جسے وہ قاری اپنی حقیقی زندگی میں مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ لہٰذا اس قاری کی پہلی کوشش ان معانی کی توثیق ہوتی ہے جو اس نے کسی اور متن سے اخذ یا قبول کیے ہوتے ہیں اور اگر توثیق نہ کر سکے تو ان اخذ شدہ معانی کو مسلط کرنے کی سعی ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک نئے متن کے روبرو ہونے کا تجربہ نہیں کرتے؛ وہ کچھ حاصل نہیں کرتے، اپنے سابق حاصل کے ساتھ نرگسیت پسندانہ تعلق کو مستحکم کرتے ہیں۔ اس سادیت پسندانہ، استبدادی رویّے کی ایک سے زیادہ نفسیاتی وجوہ ہیں۔ ایک وجہ شخصی ہے، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ دوسری وجہ پرانے اور نئے کے تضاد کو حل نہ کر سکنے میں ناکامی کا احساس ہے۔ پرانے متن

سے جذباتی وابستگی، نئے متن کا خوف پیدا کرتی ہے۔ وہ نئے متن کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور پرانے کے معانی سے دست بردار نہیں ہو پاتا اور اسی سے اس کے یہاں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس شخص سے زیادہ قابل رحم کوئی نہیں جو اپنے تضادات سے آگاہ نہ ہو اور اس سے بڑھ کر المیہ کس کا ہوگا جو اپنے تضادات کو حل نہ کر سکے۔

سپردگی میں ہوشیاری کا مطلب، زیر مطالعہ متن سے مسلسل مکالمہ ہے۔ آپ ہر ہر لفظ کو غور سے اور محسوس کر کے پڑھتے ہیں اور سوچتے جاتے ہیں۔ آپ زیر مطالعہ تحریر کو اپنی بات کہنے کا پورا موقع دیتے ہیں، پوری توجہ سے اسے سنتے ہیں۔ اس کے آہنگ، اس کے لہجے، اس کی منشا، اس کی دلالتوں، اشارت سب کو سمجھتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کو ابھرنے کا موقع دیتے ہیں اور ان کے جوابات متعلقہ تحریر میں راست تلاش کرتے ہیں یا اس کی قائم کی ہوئی تخیلی یا تعقلی فضا میں دریافت کرتے ہیں یا پھر اپنی ذہنی دنیا میں دیکھتے ہیں یا پھر دیگر کتابوں یا اشخاص کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اچھی کتابیں کوئی خاص بات، نظریہ ذہنوں میں راسخ کرنے کے بجائے، ہمیں اپنی دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنے کے قابل بناتی ہیں۔ تاہم اگر قاری سپردگی میں ہوشیار ہو تو ہر کتاب سوالات کو تحریک دینے کا باعث بن سکتی ہے، خود اپنے خلاف ہی سہی۔ مقتدر طاقتیں ایسی کتابوں کی اشاعت پسند کرتی ہیں جن کا پیغام غیر مبہم، ترغیب آمیز ہو اور ذہن کے استفساری عمل کو معطل کرتا ہو۔ مقتدرہ کے عزائم کو اگر کوئی شکست دے سکتا ہے تو وہ قاری کا استفسار پسند ذہن ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ پڑھنا بڑی حد تک موضوعی (Subjective) عمل ہے۔ باہر کی معروضی دنیا سے رخصت ہو کر، ذہن، تصور، تخیل، فنتاسی کی دنیاؤں میں ایک بچے کی سی حیرت کے ساتھ چلے آنا ہے، یعنی موضوعی حالت میں مبتلا ہونا ہے۔ عام طور پر موضوعی حالت کو منفعل کہا جاتا ہے یا خود پسندی پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن عام

موضوعی حالت اور پڑھنے کے نتیجے میں طاری ہونے والی موضوعی حالت میں فرق کیا جانا چاہیے۔ پہلی صورت میں آپ دوسروں سے یکسر بے خبر اور خود میں گم ہوتے ہیں، مگر دوسری صورت میں آپ کچھ بنیادی باتوں کا نئے سرے سے تجربہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آدمی کے ذہن، تصور، تخیل اور فنتاسی کی حدیں کیوں کر قائم ہوتی ہیں؟ آپ پر کھلتا ہے کہ یہ متن ہی ہے جو اِن حدوں کو قائم کرتا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا تصور لامحدود ہے؟ تصور کا لامحدود ہونا محض ایک فنتاسی ہے، ایک ایسا تخیل ہے جو اس لیے قبول کر لیا جاتا ہے کہ ہم اپنے تصور کو لامحدود کرنا چاہتے ہیں۔ آدمی کا ذہن، تصور، تخیل، یہاں تک کہ لاشعور بھی ساختہ ہے۔ انھیں ان زبانی و تحریری متون نے ساخت کیا ہے جو ہم تک پہنچے ہیں، جن میں سے کچھ ہمیں یاد ہیں، باقی بھول گئے ہیں۔ نیز وہ ہمارے لاشعور میں پہنچ کر اپنی صورتیں اور ہیئتیں بدل لیتے ہیں۔ آدمی کی ذہنی دنیا میں اگر کوئی شئے واقعی پُر اسرار ہے اور اسے پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا تو وہ ان متون کو نئی نئی تراکیب دینا ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے آپ بنیادی اعداد کی مدد سے کچھ حیرت انگیز اعداد وضع کر سکتے ہیں۔ لہٰذا پڑھنے کی اساسی، مکمل سرگرمی کو ممکن بنا کر ہم اس حقیقت کا ایک بار پھر ادراک کرتے ہیں کہ ہماری موضوعی دنیا ساختہ ہے، ایک تشکیل ہے، جس کا مواد ہم نے 'دوسروں' سے لیا ہے، مگر جسے ایک ترتیب ہم نے مکالمے اور استفسار پسندی کی مدد سے دی ہے۔ اس بات کو قبول کرنا آسان نہیں، مگر قبول کرنے نہ کرنے سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ ہماری موضوعیتیں (Subjectivities) کی کُنہ دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہمارے اختیار میں بس یہ ہے کہ ہم ان پر سوال قائم کر سکیں اور انھیں نئی ترتیب دے سکیں۔

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی

پیر پنچال کے غیر مسلم اُردو ادبا اور شعرا

(قسط اول)

خطۂ پیر پنچال ایسا کوہستانی علاقہ ہے جہاں سرسبز وادیاں، شاداب میدان ، بلوریں جھرنے اور آبشار، صاف شفاف فضائیں اور برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے بعض پہاڑ دیدہ زیب اور دلکش ہیں۔ یہاں کوئی بھی فطری ادیب اور موزوں طبع کا حامل انسان بے خود ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا عکس یہاں کے ادبی شہ پاروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وادی دل پذیر مسلم ادبا اور شعرا کو جہاں اپنا ادبی غازہ بنائے ہوئے ہے وہیں غیر مسلم ادبا و شعرا کی ادبی تخلیقات سے اپنی مانگ کا سندور بھرے ہوئے ہے۔ دینا ناتھ رفیقؔ، سرون ناتھ آفتابؔ، دَیا نند کپور، ٹھاکر پونچھی، بلدیو راج رہبرؔ، ٹھاکر مدن سنگھ، موتی لعل کپور، شیو رتن لال برقؔ، مالک رام آنند سے لے کر پرت پال سنگھ بیتابؔ، آنند لہر، دوشنت چوہدری، خوش دیو مینی (کے۔ڈی۔مینی) اور بلراج کمار بخشی تک خطۂ پیر پنچال کے ان تمام نمائندہ ادبا اور شعرا نے اردو شعر و ادب میں اپنا وقیع ادبی سرمایہ پیش کر کے اردو کی ادبی تاریخ میں اپنے اور اس خطے کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

بسیار تلاش و جستجو کے بعد جس قدر ادبا اور شعرا کی تخلیقات راقم کو دستیاب ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں ان تمام فن کاروں پر میں نے حتی المقدور تفصیل پیش کرنے

کی سعی کی ہے ۔یوں تو اُردو ادب کی مختلف ادبی تاریخوں اور خصوصی شماروں اور نمبروں میں ان سب کا نام اور کام کھوجنے کے بعد مایوسی ہاتھ لگی کہ ان ادبا اور شعرا کو جو مقام و مرتبہ ملنا چاہیے تھا اُس سے دانستہ یا غیر دانستہ (شعوری یا غیر شعوری) رو گردانی ہوئی ہے۔لیکن بعض مقامی علم وادب دوست اور تحریروں سے ان کے حوالے سے جو معلومات ملی اور جس قدر مواد حاصل ہوا 'اس میں سے بعض اہم پہلو یہاں پیش ہیں ۔اس ضمن میں محمد ایوب شبنم نے اپنی کتاب ''ادبیاتِ پونچھ''میں جس قدر مواد محفوظ کیا ہے' میں نے یہ مقالہ لکھنے کے دوران بہ طور خاص اس سے استفادہ کیا ہے۔ خطے کے ادبیات کو محفوظ کرنے میں محمد ایوب شبنم کا وقیع مقام ہے ۔اس کے علاوہ جناب فاروق مضطر صاحب کے بی۔ایڈ کالج کی لائبریری اور کلچرل اکیڈمی سے شائع ہونے والے اُردو ادب کے خصوصی شماروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ہر ایک کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔

زمانی ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے شعوری طور پر جو ادیب یا شاعر زمانی طور پر مقدم ہے تو اس کا تذکرہ پہلے کیا جا رہا ہے۔اس لحاظ سے مقالہ میں کبھی کوئی شاعر پہلے آتا ہے پھر ادیب اور پھر کسی شاعر کا ذکر بھی آ سکتا ہے۔ایسا نہیں کیا گیا ہے کہ اوّلاً شعرا کا ذکر ہوا اور ثانیاً ادبا کا۔اس کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ صرف شاعری ہی سنتے سنتے یا صرف نثر ہی سنتے سنتے یا پڑھتے پڑھتے طبیعت پر گراں کیفیت جو طاری ہو جاتی ہے وہ اس مقالے میں پیش نہیں آئے گی بلکہ اس ترتیب سے تحریر کے پڑھنے یا سننے میں دلچسپی کی اُمید ہے۔

دینا ناتھ رفیق: دینا ناتھ رفیق ۱۹۰۴ء میں بمقام ھوتر، جھانجل، موجودہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے جو خطۂ پیر پنچال کے جغرافیائی حدود میں آتا ہے۔ان کا اصل (دستاویزی) نام چوہدری دینا ناتھ پوری ہے ۔قلمی نام دینا ناتھ اور تخلص رفیق اختیار کیا۔انہوں نے ایف۔اے تک تعلیم حاصل کی اور محکمۂ تعلیمات میں

مدرس کی ملازمت ملی۔شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ان کے شعری مجموعہ کا نام ''سنبل وریحان'' ہے۔راقم کو ان کا شعری مجموعہ دستیاب نہ ہوسکا۔ان کے متعلق ادبی رائے جو میں نے قائم کی ہے وہ اُن کے اُس کلام کے مطالعے سے کی ہے جو محمد ایوب شبنم نے اپنی کتاب ''ادبیات ِ پونچھ'' میں شامل کیا ہے۔دینا ناتھ رفیق کا کلام روایتی اور کلاسیکی غزل کے مزاج کا ہے۔وہ اپنے کلام کی پختگی سے کہنہ مشق اور استاد شاعر معلوم ہوتے ہیں۔محبت وعشق کے حالات وکیفیات کو مختلف پیرایہ میں اپنے شعری آہنگ میں ڈھالتے ہیں۔عاشقی کی کیفیات کو بیان کرنے میں مضطرب دل رکھتے ہیں۔یاس سے آس کی راہ تلاشتے ہیں۔جدید دور کی لفظیات میں بھی بعض قلبی واردات پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر کیا ہے۔کلام ملاحظہ ہو:

رنج و آلام میں گو آج بسر ہوتی ہے
شبِ تاریک کی آخر تو سحر ہوتی ہے
بیج پھولوں کی نہیں عشق کسی سے کرنا
یہ ڈگر جان کی بازی پہ ہی سر ہوتی ہے
دل کی تخریب کا کیوں تم نے ارادہ باندھا
یہ وہ بستی ہے جو محبوب کا گھر ہوتی ہے

☆

اُجڑ جاتی ہے فرقت میں حریمِ دل کی محفل
ترے رنگیں تصور سے اسے آباد کرتا ہوں
تلطف سے نہیں کچھ کم ہے اندازِ غضب تیر
اسی ابلہ فریبی سے میں دل شاداب کرتا ہوں

ترے عفو وعطا ، جور و جفا سے دل کی بستی
کبھی آباد کرتا ہوں کبھی برباد کرتا ہوں

(مشمولہ: ادبیات پونچھ، ص: ۲۸۳)

سرون ناتھ آفتابؔ: غیر مسلم شعرا میں پیر پنچال کے دوسرے اہم شاعر سرون ناتھ آفتابؔ ہیں۔ بقول محمد ایوب شبنم، ان کی ولادت ۷؍جنوری ۱۹۰۸ء بمقام نون میانی، بھیرا، ضلع شاہ پور میں ہوئی، جو پاکستانی پنجاب کا حصہ ہے۔ نام سرون ناتھ اور تخلص آفتابؔ کرتے تھے۔ ایف۔اے تک تعلیم حاصل کر کے حکمت کا پیشہ اختیار کیا۔ یونانی ادویات کے ذریعے علاج معالجہ میں مصروف رہے۔ کچھ عرصہ تک ہفت روزہ ''آفتاب'' کے مدیر بھی رہے۔ شعر و شاعری کا اچھا ملکہ رکھتے تھے۔ ان کے کسی مطبوعہ شعری مجموعے کے حوالے سے معلومات نہ مل سکی۔ البتہ ان کی دو غزلیں ایوب شبنم نے ''ادبیات پونچھ'' میں شامل کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دورِ جدید کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں انقلابی روح رواں نظر آتی ہے۔ وہ روا داری اور انسانی ہم آہنگی پر مصر ہیں۔ ادوار کی تغیر پذیری کے سبب سماجی شعور و مزاج میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، خاص طور پر گنگا جمنی تہذیب کے منتشر ہونے کے خدشے پر وہ شیخ و برہمن کو علامت بنا کر سماجی رہنماؤں اور پیش روؤں کو خوب سخت وست سناتے ہیں۔ انہوں نے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ رام اور رحیم کے پجاریوں کو حقیقی ہمدردی کے پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ ان کی شاعری میں محبتی تغافل بھی موجود ہے۔ ان کے یہاں عاشق محبوب کو خود سپردگی نہیں کر دیتا بلکہ اُس کے حسن کا معیار و مرتبہ عاشق کے چاہنے ہی سے بنتا ہے۔ عبادت و ریاضت کا شعور ان کے یہاں گہرائی و گیرائی کا ضامن ہے۔ عرفانِ عبادت کو انہوں نے فنی ہنرمندی کے ساتھ شعر میں ڈھالا ہے۔

فنی اعتبار سے وہ پختہ مشق اور استاد شاعر معلوم ہوتے ہیں ۔ان کے یہاں غزلیہ لفظیات کا نظام جدید دور کے تغیر کا لبادہ اوڑھتے اور نئے مزاج میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔نمونۂ کلام توجہ چاہتا ہے:

عصرِ جدید میں درِجاناں بدل گیا
اب عشق و عاشقی کا فسانہ بدل گیا
اے انقلابِ دہر تیرے دم سے آجکل
گنگ وجمن کا دیکھ دہانہ بدل گیا
سب اختلاف ،شیخ وبرہمن کے مٹ گئے
انگریز چل دیئے تو زمانہ بدل گیا
بت خانہ میں بدل گئی ناقوس کی صدا
مسجد میں مولوی کا ترانہ بدل گیا
اتنے ہوئے ہیں مجھ پہ ستم ہائے روزگار
سب شعر وشاعری کا ترانہ بدل گیا

☆

تم اپنے حسن پہ اتنا نہ اتراؤ نہ اتراؤ
تمہارا حسن میرے دل کی چاہت کے سِوا کیا ہے
ہوئے اب خواب وہ لمحے جو گزرے تیرے پہلو میں
دِلِ مضطر میں ان خوابوں کی جنت کے سوا کیا ہے
نہ جانے کیا سمجھتے ہیں خدا کو یہ خدا والے
وجودِ کبریا حسنِ عقیدت کے سوا کیا ہے

نہ ہو عابد اگر جذبِ محبت تیرے سجدوں میں
تو پھر تیری عبادت ایک عادت کے سوا کیا ہے
(مشمولہ: ادبیاتِ پونچھ، ص: ۲۸۴)

دَیا نند کپور: دَیا نند کپور ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے میٹرک اور ادیب و فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ بقولِ ایوب شبنم، انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہفت روزہ ''پربھات'' کے اجراء سے کیا۔ جب کہ دَیا نند کپور کے صاحب زادے موتی لعل کپور اپنے مضمون ''مشت ِ خاک'' (جو محمد ایوب شبنم کی کتاب ادبیات پونچھ میں شامل ہے) میں ہفت روزہ ''پربھات'' کا اجراء ۱۹۲۶ء نہیں بلکہ ۱۹۳۶ء بتاتے ہیں۔ اس طرح دیا نند کپور، کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۶ء نہیں بلکہ ۱۹۳۶ء ہونا چاہیے۔ وجہ ترجیح یہ ہے کہ دیا نند کے بیٹے کا مضمون ''مشتِ خاک'' بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے اور محمد ایوب شبنم نے اپنی کتاب ''ادبیاتِ پونچھ'' میں اپنی رائے قائم کرنے میں کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ دیا نند کپور نے یہ اخبار پونچھ سے جاری کیا تھا۔ ان کے صاحب زادے موتی لعل کپور کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''انہوں (دیا نند کپور) نے ۱۹۳۶ء میں پہلا ہفت روزہ اخبار
''پربھات'' جاری کیا جو ۱۹۴۷ء تک برابر جاری رہا۔''

(مشمولہ: ادبیاتِ پونچھ، ص: ۲۴۷)

دیا نند ایک اچھے اور بے باک صحافی گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی خدمات ریڈیو کشمیر سرینگر میں بھی انجام دیں۔ ۱۹/جولائی ۱۹۸۱ء کو وفات پا گئے۔ مجھے ان کا ایک مضمون ''اُردو ادب کو پونچھ کی دین'' پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے خطۂ پیر پنچال اور خاص طور پر پونچھ کے ادبا، شعرا اور بیرونِ خطہ سے وارد ہونے والے ادبا اور شعرا کا تحقیقی و تنقیدی لیکن صحافتی زبان سے مغلوب

اور جذباتی لب و لہجے میں ذکر کیا ہے۔علاوہ ازیں مضمون میں اُن کے عہد میں اُردو کو کس طرح قسطوں میں ختم کئے جانے کے رویّئے ابھر رہے تھے‘ان پر ایک دانشورانہ محاکمہ کیا گیا ہے۔ ہر دو گروہوں کو اس بات کی دعوتِ فکر دی ہے کہ اُردو نہ تو ہندو ہے اور نہ ہی مسلمان، نہ ملکی ہے نہ غیر ملکی۔ یہ سورج کی روشنی کی طرح کسی سرحد میں محصور نہیں بلکہ اُردو انسان کی صلاحیتوں کے ارتقاء کا ایک نام ہے جس کے گونا گوں اوصاف کو انہوں نے اپنے بالغ شعور سے صحافیانہ اور اُردو کے سچّے عاشق کے طور پر رقم کیا ہے۔ان کے ذیل کے اقتباس سے اس کی عصری معنویت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے:

> ’’اُردو ہندی کی بحث پرانی ہو چکی ہے ۔اب اُردو کو غیر ملکی یا اسلامی زبان کہا جا رہا ہے ۔غریب اُردو کو ذبح کرنے کے اس نئے ہتھیار کو سان چڑھانے والوں میں مولانا پیش پیش ہیں جو خاصی سلیس اُردو کو ’’مولویانہ‘‘ اُردو بنا کر دینیات کی اشاعت میں ثوابِ دارین حاصل کر رہے ہیں۔دوسری طرف کئی بھارتی سجن پُرش اُردو کی کمائی کھا کھا کر اُردو میں بھدے، بھونڈے اور غیر مانوس شبدوں کو ٹھوس ٹھوس کر اسے شدھ بھارتی بھاشا بنا رہے ہیں ۔اب کیا کہوں کہ بے چاری اُردو نہ ہندو ہے نہ مسلمان ۔نہ ملکی ہے نہ غیر ملکی ۔سورج کی روشنی ،چاند کی ضیا باریوں کو کوئی ملکی یا غیر ملکی کیسے کہہ سکتا ہے۔اُردو تو دجلہ وفرات ،گنگ وجمن کے سنگم کی پیداوار ہے ۔اس پیداوار کو کسی ہندو یا مسلمان نے نہیں‘انسان کی ذہنی صلاحیتوں کے ارتقاء نے نکھارا ،سنوارا اور دنیا کے سامنے ہند کی دلہن بنا کر پیش کیا۔اس دلہن کے حسن کے متعلق داغؔ کا دعویٰ ہے ‘‘

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(مشمولہ:ادبیاتِ پونچھ،ص:۹۴۔۱۹۳)

اسی ذہن وشعور کی آج بھی ضرورت ہے۔اردو زبان کی تشکیل،بُنت اورارتقاء میں ہندو مسلم،سکھ،عیسائی سب کے خونِ جگراورشعور کا حصہ شامل ہے۔

ٹھاکر پونچھی: ان کا اصل نام ''جگن ناتھ ٹھاکر'' تھا۔ادبی حلقوں میں ٹھاکر پونچھی کے نام سے مشہور ومقبول ہوئے۔شیرازہ (اردو) افسانہ نمبر میں نور شاہ لکھتے ہیں کہ ٹھاکر پونچھی دسمبر ۱۹۲۲ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے۔ایوب شبنم ادبیات پونچھ میں لکھتے ہیں کہ ان کی پیدائش محلّہ جرنیلا ں پونچھ میں ہوئی۔اُن کے والد کا نام بھیم سین تھا۔انہوں نے حصول تعلیم کے لیے زندگی کا زیادہ تر حصہ جموں میں گزارا۔ بی۔اے تک انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ان کی ادبی جہتیں مختلف ہیں۔ناول اورناولٹ سے لے کر افسانہ نگاری تک ان کا اشہبِ تخلیق روانہ رہا ہے۔ان کے ناولوں کی تعداد درجنوں میں ہے۔نور شاہ کے مطابق ان کا پہلا ناول ''وادیاں اور ویرانے'' ہے۔ان کی پہلی کہانی کا عنوان ''کالکی'' ہے جس کی اشاعت جموں کے مقامی اخبار ''چاند'' میں ہوئی۔

(نور شاہ:ریاست کے افسانہ نگاروں کی کہکشاں:مشمولہ:شیرازہ،جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ نمبر،ص:۱۷)

جب کہ ٹھاکر پونچھی کے تایا زاد بھائی ٹھاکر مدن سنگھ،جواُن کے معاصر بھی تھے اوردوست ومربی بھی،انہوں نے اپنے مضمون ''ٹھاکر پونچھی ہم اوروہ'' میں لکھا ہے:

''ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی ''خانہ بدوش'' تھی جبکہ ان کا آخری افسانوی کارنامہ ''یہ موتی ابھی کچے ہیں'' اس آخری افسانے کا پس

منظر کشمیر کی وادی ہے ۔مرحوم کا پہلا ناول ''ڈیڈی'' تھا ۔یہ ناول
اُونچے لوگوں کے سماج کے قول وفعل اور کردار کی عکاسی کرتا ہے۔''
(مشمولہ:ادبیاتِ پونچھ،ص:۲۰۳)

اس سے معلوم ہوا کہ نور شاہ نے شیرازہ افسانہ نمبر میں جس کہانی اور ناول کو ان کی اولیت کا درجہ دیا ہے، وہ محلِ نظر ہے۔صحیح تخصیص ٹھاکر پونچھی کے تایا زاد بھائی ٹھاکر مدن سنگھ کی معلوم ہوتی ہے۔کیوں کہ وہ قریبی رشتہ دار ہونے کے علاوہ اُن کے مربی، دوست اور معاصر خاص بھی تھے۔دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ نور شاہ نے اُن کی کہانی اور ناول کا درجہ متعین کرنے میں کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔لہٰذا میرے نزدیک ٹھاکر مدن سنگھ کا قولِ صحیح اور مرجع ہے:۔

''زندگی کی دوڑ''،''چناروں کے چاند''اور یادوں کے کھنڈر''ان
کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں ۔''ڈیڈی''،''وادیاں اور
ویرانے''،''رات کے گھونگھٹ''،''قفس اداس ہے''،''شمع ہر
رنگ میں جلتی ہے''اور''زلف کے سر ہونے تک''ان کے مشہور
ناول ہیں۔''کیلوں کا مزار''،''یہ رشتے' یہ لوگ''ان کے ناولٹ
ہیں ۔ٹھاکر مدن سنگھ کے مضمون''ٹھاکر پونچھی ہم اور وہ''کے
مطابق''دسمبر ۱۹۲۲ء سے ۱۴/اگست ۱۹۷۴ء تک اپنی ۵۲ سالہ
زندگی میں ٹھاکر پونچھی دو درجن سے زائد ناول اور پونے چار سو
کے قریب افسانے لکھے ۔ٹھاکر صاحب کی بیشتر کہانیوں کے
ترجمے ہندی، پنجابی، مراٹھی، ملیالم اور بنگلہ میں بھی ہوئے۔''
(مشمولہ:ادبیاتِ پونچھ،ص:۲۰۳)

نور شاہ نے شیرازہ افسانہ نمبر میں لکھا ہے:

''ٹھاکر پونچھی نے ریڈیو جموں سے ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سیکشن میں خدمات انجام دیتے رہے۔''۲۴/اگست ۱۹۷۷ء کو ایک حادثہ کا شکار ہو کر ابدی نیند سو گئے''۔

(ریاست کے افسانہ نگاروں کی کہکشاں: مشمولہ شیرازہ: جموں وکشمیر میں اردو افسانہ، ص:۱۹۔۱۸)

یہاں پر نور شاہ نے ٹھاکر پونچھی کی وفات کا سن ۲۷/اگست ۱۹۷۷ء لکھا ہے جب کہ ٹھاکر پونچھی کے بھائی، ٹھاکر مدن سنگھ کا مضمون ''ٹھاکر پونچھی ہم اور وہ'' ماہنامہ ''شاعر''، بمبئی کے دسمبر ۱۹۷۴ء کو ان کی وفات کے بعد چھپا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ٹھاکر پونچھی کی وفات ۱۹۷۷ء نہیں بلکہ ۱۹۷۴ء ہے۔ اس کی وضاحت ٹھاکر مدن سنگھ کے مضمون کے آخر میں وضاحتی نوٹ لگا ہوا ہے کہ یہ ''شاعر'' بمبئی میں چھپا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''یہ مضمون ٹھاکر پونچھی کی وفات کے بعد لکھا گیا اور اُس وقت ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے دسمبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں شائع ہوا''

(مشمولہ: ادبیاتِ پونچھ، ص:۲۰۶)

دوسرے مقام پر اپنے مضمون ''ٹھاکر پونچھی ہم اور وہ'' میں مدن سنگھ ٹھاکر پونچھی کی تمام حیات کا حصار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۲۲ء سے ۱۴/اگست ۱۹۷۴ء تک اپنی ۵۲ سالہ زندگی میں ٹھاکر پونچھی نے دو درجن سے زائد ناول اور پونے چار سو کے قریب افسانے لکھے''

(مشمولہ: ادبیات پونچھ، ص:۲۰۳)

اس سے معلوم ہوا کہ نور شاہ نے جو تاریخ وفات ۲۴؍اگست ۱۹۷۷ء بغیر کسی ماخذ کے لکھی ہے، صحیح نہیں بلکہ صحیح وہ تاریخ ہے جو ٹھاکر پونچھی کے بھائی ٹھاکر مدن سنگھ نے، اپنے مضمون میں ۱۴؍اگست ۱۹۷۴ء لکھی ہے۔

جہاں تک ٹھاکر پونچھی کے فن کا تعلق ہے، ان کی افسانوی لفظیات میں شعریت ہے۔ کہانی بُننے میں پلاٹ کا خاص لحاظ رکھتے ہیں لیکن ان کی کہانی کا لہجہ اور کیفیت رومانوی ہے۔ حالانکہ وہ ترقی پسند نظریات کے حامی بھی ہیں اور پریم چند کی قبیل کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ایک کہانی ''ادھ جلی رات'' ہے جس میں ہیروئن ''فلورا'' ہے جو وقت کے بے رحم تھپیڑوں اور کسی آوارہ پیار کی بے وفائی کی زد میں آئی ہے۔ ناچار ایک کلب ڈانسر (رقاصہ) بن جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے بعض حصوں میں سے کسی حصہ میں اس کے پیار کا دم بھرنے والا ''کشور'' ہے اور ایک حصے کی روشن یادوں میں ایک ''روشن'' ہے۔ اس کی اس آوارہ زندگی کو سنگیت کے محور پر نچانے والا ایک وائلن ماسٹر جی ہے جو نہایت کریہہ صورت اور ادھیڑ عمر کا ہے۔ اس کہانی کی ہیروئن، کھوکھلی محبتوں سے ہار کر احتجاجاً اسی وائلن ماسٹر جی سے شادی کرنے کی ضد کر بیٹھتی ہے۔ فنی اعتبار سے اس کہانی میں سَقم یا جھول یہ ہے کہ (فلورا) نے احتجاجاً اور خود کو سزا دینے کے طور پر کریہہ صورت شخص سے شادی کی ہے۔ المیہ اس لڑکی ''فلورا'' کا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن کہانی کار نے المیہ 'کشور' کا دکھایا ہے۔ گویا ٹھاکر پونچھی نے مرد اساس معاشرے کے زیرِ اثر مرد کو مظلوم دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ ''فلورا'' بے وفا محبتوں سے ہار کر احتجاجاً اور سزا کے طور ایک کریہہ صورت ماسٹر جی سے شادی کرنے کی ضد کر بیٹھی تھی، تو اسی المیہ پر کہانی کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ دوسری بات ٹھاکر پونچھی کے اسلوب کی خوبی کہیے یا خامی کہ کہانی کے آغاز، وسط سے انجام تک رومانی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ لیکن اتنا ضروری ہے کہ ٹھاکر پونچھی کہانی بُننے اور

کرداروں کونفسیاتی الجھن میں گھیرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔اس کے علاوہ وہ کہانی کوتخلیقی اور علامتی زبان میں ڈھال کر اُس کے معنوی تنوع میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے افسانہ ''ادھ جلی رات'' سے دو چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''آدھی رات کی بھیگی بھیگی سی چاندنی میں اس نے فلورا کو ایک نئے رنگ وروپ میں دیکھا۔ایک اُداسی تھکی سی متین صورت ،سفید لٹھے کی شلوار، چھینٹ کی قمیض، گردن کے گرد لپٹا ہوا ریشمی دوپٹہ اوراس پر بکھری ہوئی آوارہ زلفیں۔اور دیکھنے کا شرمیلا الھڑ سا انداز جیسے پہلی بار گھر کی چار دیواری سے نکلی ہو، جیسے پہلی بار نظریں کسی سے ٹکرائیں ہوں۔اب اس کے سامنے ہوٹل کے نشہ آلود ماحول کی فلورا نہ تھی''

.....''ایک رات اس نے فلورا کو شہر کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں رقص کرتے دیکھا.....ایک نئے روپ میں دیکھ کر جھینپ گیا۔محسوس ہوا جیسے اس کا اپنا عمروں کا پیار نیم عریاں لباس میں بِک رہا ہو۔''

.....جس کے ساتھ (ایک دوسرا عاشق روشن)ایک رات نیم عریاں لباس میں ہوٹل میں داخل ہوئی تھی اس کے ساتھ باہر نکلنا چاہتی ہو اور باہر نکل کر...''میں نے پازیب کی آرزو کی تھی، گھنگرو ملے، میں نے چھوٹے سے پُرسکون گھر کی تمنا کی تھی، ہوٹل کشادہ ،مترنم، چار دیواری ملی''.....کشور نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا''میں تمہیں گھنگروؤں کی جگہ پازیب دوں گا ۔ہوٹل کی چار دیواری سے نکال کر ایک چھوٹا گھر دوں گا''

''وہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''پہلے ہم دونوں رہتے تھے، روشن چلا گیا۔ ماسٹر جی کو لے آئی، اس کی وائلن کو لے آئی جس کی چیخوں سے کبھی مجھے نفرت تھی، اب پیار ہے۔ جانتے ہو کیوں؟'' کشور خاموش رہا۔ ''صرف اس لیے کہ روشن کو ماسٹر جی پسند نہ تھا اس کی وائلن''

(ادھ جلی رات: مشمولہ: ادبیاتِ پونچھ)

استعاراتی، تشبیہاتی، علامتی تخلیقی زبان کا حسن ملاحظہ کریں:

''کشور خاموش بیٹھا رہا، ان لمحوں کا انتظار کرتا رہا جو ہر سوال کا جواب اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ فلورا کو بھی شاید ویسے ہی لمحوں کا انتظار تھا۔ خاموش بیٹھی چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتی رہی، حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی بدلیاں چاند کی سیمیں وسعتوں میں سما گئیں۔ چاندنی یکبارگی کھل اٹھی، فلورا کی موٹی موٹی آنکھیں جھکتی گئیں۔ برف جیسے سفید اُداس چہرے پر شفق کی لالی اور شوخی تھرتھرانے لگی.....''

(ادھ جلی رات: ایضاً)

افسانے کا اختتامیہ ملاحظہ ہو:

''روشن کی طرح تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اس پیار کے پیچھے برسوں کی منتظر نگاہوں کا احساس ہے لیکن میں تمہاری عمر سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ اس عمر سے شادی کروں گی، اس مکروہ جسم کو اپناؤں گی جس سے روشن کو نفرت تھی، جس سے تم بھی نفرت کرتے ہو۔ اپنے خوبصورت جسم سے نہیں بلکہ بدصورت پیار سے انتقام لینے کے

لئے .....فلورا بڑبڑاتی ہوئی ماسٹر جی کے قدموں پر گر گئی ۔
ماسٹر جی وائلن سینے سے لگائے کھڑا رہا۔اس کا چیچک زدہ چہرا
مسکرا رہا تھا.....''

(ادھ جلی رات:ایضاً)

اس کہانی کو اسی مقام پہ ختم ہو جانا چاہیے تھا' جہاں فلورا کا المیہ، ماسٹر جی کا طربیہ اور کشور کا خاموش المیہ معنی خیزی میں تنوع کا سبب بنتا۔لیکن اندرونی حمایت میں کہانی 'کشور' کی طرف بڑھ جاتی ہے۔اس سے آگے کی حمایت ملاحظہ ہو:

''کشور محبت کی پرچھائیں کو سینے سے لگائے باہر نکل گیا۔آج
اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی دیرینہ ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ
گیا تھا۔لیکن بچھڑنے والے کا اسے نام یاد نہ تھا۔شاید اس کی
اپنی کوئی دیرینہ آرزو بچھڑ گئی تھی ۔اور شاید وہ آج خود ہی اپنی
ذات سے بچھڑ گیا تھا، ہمیشہ کے لئے مر گیا تھا۔''

(ادھ جلی رات:ایضاً)

ٹھاکر پونچھی کے اس افسانے کے آخری اقتباس نے کشور کے المیہ کی جو وضاحت کر دی ہے' اس نے اس کہانی کے تاثر پر حرف کھڑا کیا ہے اور فطری تاثر کو کم کر دیا ہے۔ابہامی المیہ کا جو حسن و جمال تھا اُس کو متاثر کر دیا ہے ۔لیکن اس کے باوجود شعور کے عناصر اس کہانی میں گاہ گاہ موجود ہیں۔ٹھاکر پونچھی کی ناول نگاری کے حوالے سے مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے جو رائے قائم کی ہے' اس رائے کے عناصر ان کی افسانہ نگاری میں بھی ملتے ہیں۔وہ رقمطراز ہیں:

''ٹھاکر پونچھی کے ناول تشکیک کے پندار کو توڑتے ہیں اور جو
نفسیاتی الجھاؤ ان کے ناولوں میں پائے جاتے ہیں اور دوسرے

ناول نگاروں کے ہاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔''

(بحوالہ: ٹھاکر مدن سنگھ: ٹھاکر پونچھی، ہم اور وہ، مشمولہ: ادبیات پونچھ: ص۲۰۴)

یہی نفسیاتی الجھاؤ ٹھاکر پونچھی کے اس افسانے ''ادھ جلی رات'' کے تینوں کرداروں (فلورا، روشن اور کشور) میں دیکھنے کو ملتا ہے جو اس کہانی کے تجسس اور تاثر میں اضافہ پیدا کر رہا ہے۔ اس طرح ٹھاکر پونچھی نے اپنی چوبیس سالہ ادبی ریاضت سے اُردو ادب کی وقیع ترین خدمت کی ہے۔ اپنے ادبی سرمائے سے ادیبوں کو متاثر کیا ہے اور نامور ادیب بھی پیدا کیے ہیں۔ ٹھاکر پونچھی کے یہاں سامراجی اور برہمن سماج کے تصورات اور رسومات پر ادبی احتجاج و مزاحمت بھی موجود ہے۔ طبقاتی کشمکش کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں اشرافیہ خاندان، شخصی بالا دستی کے خلاف احتجاج اور مزاحمت ملتی ہے۔ اس طرح ترقی پسند عناصر بھی ان کے یہاں سمٹ آتے ہیں۔

بلدیوراج رہبر: بلدیوراج رہبر کا پورا نام، بلدیوراج دتہ ہے۔ رہبر تخلص اپنایا۔ بخشی کرپارام کے یہاں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو درآبہ سرنکوٹ پونچھ میں پیدا ہوئے۔ دسویں کے بعد جوڈیشل کلرک کی ملازمت ملی۔ طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ لہٰذا شاعری ہی کو اڑھنا بچھونا بنایا۔ سرکاری نوکری ملی تو تھی، کچھ عرصہ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ مگر ملازمت کی بندشیں راس نہ آئیں اور نوکری چھوڑ دی۔ طبیعت کی آوارگی نے شراب نوشی میں ٹھہراؤ پایا۔ محمد ایوب شبنم ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''رہبر بحیثیت جوڈیشل کلرک ڈپٹی کمشنر پونچھ کے دفتر میں ملازم رہے اور بعد ازاں ڈسٹرکٹ کورٹ پونچھ میں بھی کام کیا۔ لیکن فطری اور پیدائشی شاعر زیادہ دیر تک نوکری کی بندشوں کو برداشت نہ کر سکا اور نوکری سے منہ موڑ لیا.....ازدواجی زندگی

منتشر ہوگئی ۔والدین کب کے چل دیئے تھے ۔کل ملا کر
مایوسیوں نے ایسا گھیرا کہ بکھر کر رہ گئے ۔''

(ادبیاتِ پونچھ:ص۲۳۶)

رہبر نے نظم بھی کہی اور غزل بھی لیکن غزل میں ان کے جوہر خاص طور پر نکھر تے ہیں ۔وہ غزل کے شاعر تھے ۔ظاہری نمود ونمائش اور باطنی شیطانی صفت کے افراد سے وہ سخت بیزار رہے ۔وہ اپنی شاعری میں ان کے قول وفعل کے تضاد کو طشت از بام کر دیتے ہیں ۔ان کا کوئی شعری مجموعہ طبع نہ ہوسکا ۔اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کلام لکھ کر پھر خود ہی پھاڑ دیتے تھے ۔ان کا جو کلام موجود ہے کہ وہ بھی بقول ایوب شبنم ان کے دوستوں کے حافظے کی مدد سے محفوظ کیا گیا ہے ۔ان کے کلام کا بعض حصہ ''ادبیات پونچھ'' میں شامل ہے ۔اسی کلام سے ان کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں' جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس بے باک اور بے لوث طبیعت کے فن کار تھے:

ان کی آنکھوں سے جام پیتے ہیں
پینے والے تمام پیتے ہیں
ظاہراً لوگ جو نہیں پیتے
پردہ ہو تو تمام پیتے ہیں

☆

کیا کہوں ہر آرزو کا کیا ہوا
خون ہر ہر گام پر دل کا ہوا
آپ آئے ہیں خیالوں میں مرے
یا میرے احساس کو دھوکا ہوا

ہم تو پا بندِ وفا ہیں آج بھی
ہاں نظامِ حسن ہے بدلا ہوا
عشق میں رہبرؔ کسی کے فیض سے
دل کبھی شبنم کبھی شعلہ ہو

☆

کچھ شوق کے مارے پیتے ہیں کچھ درد کے مارے پیتے ہیں
بدنام تو میں ہوں لوگوں میں لیکن یہ سارے پیتے ہیں
کچھ پیتے ہیں مے خانوں میں اور کچھ جا کر بت خانوں میں
جو باقی لوگ نہیں پیتے ' وہ غم کے دھارے پیتے ہیں

ٹھاکر مدن سنگھ: مدن سنگھ، ٹھاکر پونچھی کے تایا زاد بھائی تھے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۲۸ء کو محلّہ جرنیلاں، پونچھ میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں علم وادب کی اہمیت زیادہ رہی، جس کے سبب میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے مدرس رہے بعد میں محکمۂ اکاؤنٹس میں کیشئر بن گئے۔ کہانی لکھنے پر مائل ہوئے۔ اپنے خاندان کے علمی اور ادبی ماحول کے بارے میں ٹھاکر مدن سنگھ خود اپنے ایک اہم اور معلوماتی مضمون ''ٹھاکر پونچھی، ہم اور وہ'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''گھر میں اکثر منشی پریم چند، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرتؔ اور کے۔ ایل سہگل کا تذکرہ ہوتا تھا۔ گھر میں ہو رہی ان باتوں کو بڑے انہماک سے سنا کرتے تھے۔''

(مشمولہ: ادبیاتِ پونچھ: ص ۲۰۲)

ٹھاکر مدن سنگھ نے افسانے لکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تحقیقی مضمون بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک مضمون ہے ''ٹھاکر پونچھی، ہم اور وہ''۔ اس میں ٹھاکر پونچھی

کے حالاتِ زندگی ،ان کے شعور ومزاج اور ان کی تخلیقات کے وجود میں آنے کے اوقات وتاریخیں لکھی ہیں ۔وہ نہایت ہی معلوماتی ہیں ۔یہ معلومات ٹھاکر پونچھی کی تخلیقات کی تفہیم میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ٹھاکر کرمدن سنگھ کا ایک افسانہ ''سورگ سیڑھی'' ہے جس سے ان کے تخلیقی شعور اور فنی مرتبہ کا علم ہوتا ہے۔اس افسانے میں ایک ایسی ضعیفہ کا ذکر ہے جس کی عالم شباب میں شادی ہوئی ،لیکن عین جوانی میں اس کا شوہر گزر گیا۔اس کے یہاں ایک بیٹا ہوا۔اُس کی شادی ہوئی ،اس کا بھی ایک بیٹا ہوا اور خود بیٹے کا باپ وفات پا گیا۔ اب یہ ضعیفہ پوتے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی ،لیکن وہ جوانی کی دہلیز پر آوارگی کا شکار ہوگیا۔شراب نوشی میں سب کچھ بھول بیٹھا۔اس کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا' جس سے اس مصیبت زدہ ضعیفہ کی اُمید بر آئی۔غم سہتے سہتے پڑ پوتا ہوا۔شادی کے ساتھ ہی ضعیفہ کا سلوک اپنی بہو کے ساتھ بہت بُرا رہا۔لیکن جب ضعیفہ کو معلوم ہوا کہ بہو حاملہ ہے تو پڑ پوتے کی لالچ میں وہ اس سے ہمدردی اور محبت دکھانے لگی۔اس طرح ٹھاکر مدن سنگھ نے سماج کے مختلف رشتوں کا درد اور مجبور ضعیفہ کی پسماندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی خودغرضی سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کے گیسو، مادھو اور بدھیا،سب کرداروں کے ساتھ جیسے قاری کو ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ،مدن سنگھ کے ''سوگ سیڑھی'' کے کردار ضعیفہ کی خودغرضی کے باوجود اُس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔سماجی بے اعتدالیوں کو وہ فنی نقطۂ نگاہ سے ابھارنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس طرح مدن سنگھ خود کو جدید افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کر لیتے ہیں۔اس کہانی کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''اس دن کے لئے ہی دادی اماں بڑھاپے کا بوجھ سنبھالے زندہ تھی۔آج تک جہنم کے شعلوں سے کھیلتی آئی تھی۔ایک لمبی

عمر سے دُکھ اور مصیبتیں جھیلتی آئی تھی ۔صرف یہ آرزو لئے زندہ تھی کہ دنیا میں جیون کا سکھ نہیں ملا ۔کم سے کم دوسری دنیا میں تو سکھ ملے گا اور دھرم گرنتھوں میں لکھا ہے کہ پڑپوتا وہ سیڑھی تھام سکتا ہے جو سیدھی سورگ کو جاتی ہے ۔''

''بہو کے لئے نئی بات تھی ۔کل تک یہی دادی ماں تھی جو اسے ہزار ہزار صلواتیں سناتی تھی ۔لیکن آج اور کل میں کتنا فرق تھا۔آج تو دادی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ،آنکھوں میں چمک تھی ،.....بہو دادی ماں کا نیا رنگ دیکھ کر خاموش ہوگئی ۔دادی ماں نے پوچھا ۔خاموش کھڑی کیا دیکھ رہی ہو ؟''.....وہ سر جھکائے اپنے کمرے میں جانے لگی تو دادی ماں نے روک لیا۔دیر تک اس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی ۔اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔تمہارا نام لے لے کر میں اپنے آپ کو کوستی تھی ۔تم تو گھر کی لکشمی ہو،تم نہ ہوتیں تو میرا پڑپوتا کہاں سے مجھے ملتا۔کس کے گلے میں سورگ سیڑھی ڈالتی ۔کس کے سہارے سورگ میں جاتی ۔تم نے میرا جیون سپھل بنا دیا۔خوب ہنسا کرو،مسکرایا کرو،یہی تو عمر ہے ۔''

(ٹھاکر مدن سنگھ:''سورگ سیڑھی''مشمولہ:ادبیاتِ پونچھ)

موتی لعل کپور: یہ بھی خطۂ پیر پنچال کے اہم ادیبوں میں سے ایک ہیں ۔ موتی لعل کپور، چوہدری دَیانند کپور کے یہاں ۱۷ر مئی ۱۹۲۹ء کو پنڈتاں محلّہ پونچھ میں پیدا ہوئے ۔بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور ادیب فاضل کے امتحان بھی پاس کئے ۔اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن رہے ہیں ۔۱۹۸۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ۔تصنیف میں ایک تذکرہ ''روشن چراغ'' شامل ہے۔والد گرامی دیانند کپور کی جب وفات ہوئی ،تو ان کی استھیاں بہانے کے لیے گنگا کا سفر کیا۔اس سفر کی تفصیلات والد کی والہانہ عقیدت کے ساتھ اپنے ایک مضمون ''مشتِ خاک'' میں پیش کیا ہے۔

اس مضمون میں انہوں نے والد کے حالات زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کو حتی المقدور درج کرنے کی کوشش کی ہے۔ دَیانند کپور پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والے کے لئے یہ مضمون اور تحریری دستاویز اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیورتن لال برقؔ: برقؔ خطۂ پیر پنچال کے نامور شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ شیورتن لال ۲۷/مارچ ۱۹۳۵ء کو شری بخشی کلنشی رام کے گھر در آبہ سرنکوٹ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ایس۔سی کے بعد ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کی۔اس طرح وہ معالج بن گئے۔شاعری کا ذوق تھا اور طبیعت موزوں پائی تھی، تخلص برقؔ اختیار کیا اور عمدہ شعر کہنے لگے۔صحافت سے بھی جڑے رہے۔ ماہنامہ ''برق'' کے مدیر رہے۔ ''برق وشرر'' اور ''روح محبوب'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔زبان پر اچھی دسترس تھی۔ گیتا اور رامائن کا ترجمہ ''برق گیتا'' اور ''برق رامائین'' کے نام سے کیا۔انہوں نے جہاں قلبی واردات، حسن وعشق کے مشاہدات، احساسات وخیالات کو شعری سانچے میں ڈھالا ہے، وہیں قدرت کی بکھری ہوئی حسین کائنات پر غور وفکر کر کے قدرت کے رنگا رنگ کرشموں کو فنی ہنرمندی کے ساتھ شعری پیکر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قدرت پر حد درجہ کا توکل ویقین رکھتے ہیں۔ان سب اوصاف کی ترجمانی ان کا کلام کرتا ہے۔نمونہء کلام ملاحظہ ہو:

محبت تو ہے کارِ سرفروشاں
محبت میں خیالِ زندگی کیا؟
حسینوں کی عنایت پر نہ جانا
فریبِ دوستی ہے دوستی کیا ؟
نہ ڈر اے برقؔ !تو بد نامیوں سے
نہ رُسوا جو کرے وہ عشق ہی کیا؟

تری قدرت کا کیا ہے ؟وہ چاہے ناگہاں کردے
فلک زیرِ زمیں کردے' زمیں بر آسماں کردے
بہاروں کو بدل ڈالے خزاں کے رنگ میں یک دم
جو وہ چاہے خزاؤں کو بہارِ بے خزاں کردے
بدل دے بزمِ شادی کو وہ پل بھر بزمِ ماتم میں
جو ہو اس کی رضا شامل غموں کو شادماں کردے
جو وہ چاہے تو صیادوں کو کر دے قید پل بھر میں
نشیمن کو قفس کردے قفس کو آشیاں کردے
(مشمولہ:ادبیات پونچھ:ص۲۹۶)

(جاری)

☆☆☆

☆.....ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی

نرسنگداس نرگسؔ: ہمہ جہت تخلیق کار

''اردو صحافت کا شہسوار، قدمیانہ اور سڈول، تمکنت آمیز شش نقوش، نیم گندمی رنگ، بیضوی چہرہ، روشن اور چوڑی پیشانی، نگاہ میں عقاب کی تیزی، حکمرانوں کے غرور سی اُبھری ٹھوڈی، داڑھی مُونچھ پر کرزن کا سایہ، آواز کرخت نہ شیریں، لباس کے معاملہ میں اکھنڈ بھارت، نیپالی نمونہ کی ٹوپی، لکھنوئی اچکن، پنجابی کُرتہ، مدراسی دھوتی، گجراتی جاکٹ اور ان تمام میں اُلجھے ڈوگرہ انداز۔''

یہ خدوخال ''نرسنگداس نرگس'' کے بارے میں جموں کے مشہور صحافی اور روزنامہ ''ہند سماچار'' کے ایڈیٹر آنجہانی پنڈت دیا کرشن گردشؔ نے ۱۹۴۴ء میں تحریر کئے ہیں۔ ممولا رامکوٹی، پریم منوہر اور نرگس۔ یہ تین تخلص رکھنے والے دیوان نرسنگھ داس اپنے نام کے ساتھ ''رئیس التحریر چاندؔ'' کا لقب بھی لکھا کرتے تھے۔

جمّوں نرگسؔ کا وطن اور ان کی ادبی سرگرمیوں کی نشوونما کا مرکز رہا ہے۔ وہ ترکِ ملازمت کے بعد رام کوٹ (ضلع کٹھوعہ) سے جمّوں آ گئے اور دیوان پریس قائم کیا جس سے جلد ہی اخبار ''چاند'' جاری کیا جو اپنی مقبولیت اور مسلسل اشاعت کی وجہ سے اُردو صحافت میں ایک مقام پیدا کر گیا۔

دیوان نرسنگداس نرگسؔ ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ تصنیف

وتالیف اور صحیفہ نگاری کا یہ ادارہ ایک مساوی نام دیوان برادرس سے متعارف ہے جس کے ایڈیٹر نرگس کے فرزند اقبال تمنائی تھے۔ گلزار احمد فدا نے بھی اس کی ادارت کی۔ یہ ۴۳-۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک نکلتا رہا۔ اس زمانے کے سارے مشہور انشاء پرداز اور شاعر اس میں لکھتے تھے۔ جن میں خاص طور پر اندر جیت لطف، منوہر لال دل، محبوبہ یاسمین، پردیسی، منہاس، اللہ رکھا ساغر، صادق کاشمیری، رونق کاشمیری، رسا جاودانی، اعجاز ساقی، دیا کرشن گردش، کشن سمیل پوری، حمید نظامی، حبیب کیفوی، معراج الدین احمد اور غلام حیدر خان چشتی قابل ذکر ہیں۔

دیوان نرسنگھ داس نرگس ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصّہ لیتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں نرگس صاحب پنجابی کوی دربار کے پریذیڈنٹ۔ ماہ اگست ۱۹۴۱ء میں آپ جموں جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کی زیر صدارت جب جموں میں آل جموں وکشمیر پریس کانفرنس منعقد ہوئی تو نرگس صاحب نے صدرِ استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھا۔ نرگس صاحب شعروسخن کے رسیا تھے۔ پنجابی اور اُردو کی ہر محفل میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ایک انٹرویو میں اپنی شاعری کے متعلق انھوں نے کہا ؎

شعر کا جب ذہن کے ہاتھوں میں لیتا ہوں رباب
سامنے میرے چلی آتی ہے فطرت بے حجاب
دوڑتا ہوں حسین نغموں کے زینوں پر کبھی
تیرتا ہوں میں ستاروں کے سفینوں پر کبھی

نرگس صاحب نے ''تاریخ ڈوگرہ دیس'' میں چھپی اپنی تصویر کے نیچے شائع کرنے کے لئے ایک نہایت موزوں شعر کا انتخاب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جس قدر تصویر کے کاغذ کو ممکن ہے بقاء　　اُس قدر ممکن بقا کب صاحبِ تصویر کو

ریاست میں اُردو صحافت کے جو اہم ستون تصوّر کئے جاتے ہیں، نرسنگداس نرگسؔ اُن میں سے ایک تھے۔ اسے جمّوں خطّے کی خوش نصیبی تصوّر کیا جانا چاہیئے کہ یہاں ایک ایسے شخص نے جنم لیا جو نہ صرف ایک صحافی بلکہ محقق، ادیب، شاعر اور مورخ بھی تھا۔ انھوں نے ان تمام میدانوں میں نا قابلِ فراموش نشان چھوڑے۔ ان کی شخصیت کی اسی ہمہ گیری نے دلجیت ورما کو ''نرسنگداس نرگسؔ کی صحافتی خدمات'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ لکھنے کی ترغیب دی۔

دیوان نرسنگداس نرگس ۱۶ ستمبر ۱۹۰۲ء کو موضع گندل (سیالکوٹ۔ حال پاکستان) کے ایک نہایت معزّز مہاجن خاندان کے سرکردہ رُکن دیوان بیلی رام کے ہاں تولد ہوئے۔ نرگسؔ کے پڑدادا دیوان دتہ مل نے گُمّٹ جمّوں کی لڑائی میں حملہ آوروں کو شکست دے کر لکھن پور سے پار کر دیا تھا اور جسروٹہ پر دوبارہ قبضہ کیا تھا۔ اُن کے بھائی دیوان کنہیالال نے باہو کے بجائے ٹاہو تک سرحد مقرّر کی۔ یہ فوجی مشیر تھے۔ ان کے تیسرے بھائی دیوان ارجن مل نے نمبرداروں اور ذیلداروں کی مدد سے جمّوں سے بانہال تک سڑک بنوادی تھی جس پر سرکار کا صرف چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔

(موہن لال موتیا۔ چاند جمّوں شمارہ ۳ دسمبر ۱۹۷۳ء، ص۔ ۱۱)

ان کے والد بزرگوار دیوان بیلی رام ریاست میں ہی ملازم تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد جموں شہر میں ہی آباد ہوئے۔ نرگسؔ نے اپنی تعلیم ایک مقامی پرائیویٹ مکتب میں پائی۔ ڈوگرہ اور صرافی کی رسم الخط بھی اُسی مکتب سے سیکھے۔ نرگسؔ نے مڈل کا امتحان رنبیر سنگھ ہائی سکول جمّوں سے پاس کیا۔ میٹرک اکبر اسلامیہ ہائی سکول جموں سے پاس کیا۔ اُردو، ڈوگری اور پنجابی میں آپ نے بہت کچھ لکھا۔ عمر بھر شاعری کی۔ ۱۹۱۵ء میں جب آپ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے تو اُردو زبان میں شاعری کی

شروعات کی۔میٹرک کے بعد پنجابی زبان میں شاعری کا آغاز کیا۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں مختلف سرکاری دفاتر کی متواتر چار برس تک خاک چھاننا پڑی۔ بالآخر ۱۹۳۳ء میں رام کوٹ کے راجہ کے دفتر میں کلرک کے عہدے پر تعینات ہوئے اور جاگیردار رام کوٹ نے آپ کی محنت، کام کی لگن اور ایمانداری سے متاثر ہوکر تین سال کے بعد کلرک کے مختارِ عام Personal Secretary بنادیا۔ چنانچہ نرگسؔ تیرہ سال تک اسی عہدے پر فائز رہے۔۱۹۳۹ء میں جب آپ نے جاگیردار سے معمولی اختلاف پر بطور احتجاج اپنی سولہ سالہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ملازمت ترک کرنے کے بعد آپ صبح شام دھنتھلی کی ڈھکی اُتر کر دریائے توّی پر چلے جاتے اور رام کوٹ کی طرف مُنہ کرکے توّی کی لہریں گھنٹوں گننے کے بعد مایوس ولاچار واپس آجاتے۔فکرِ معاش خون خشک کرنے لگی۔آپ کے والد اس وقت بیس روپے ماہانہ پینشن یاب تھے اور دونوں چھوٹے چھوٹے بھائیوں گیان چند دیوان اور دیوان چند دیوان کی معمولی آمدنی اُن ہی کے جیب خرچ تک محدود تھی۔آپ کا اکلوتا لڑکا اقبال نرگسؔ اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اتنے بڑے کنبے کے اخراجات کا سارا بوجھ آپکے کندھوں پر تھا۔اُسی دوران ایک بزرگ خدادوست آپ کی جنم پتری کو بغور ملاحظہ کرنے کے بعد لپیٹ کر آپ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مُسکرا کر کہنے لگے:۔

''ایشور کو یاد کرو اور دیکھو اس کی لیلا تمہارے لئے کیا رنگ جماتی ہے۔
میرا خیال ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر تم اپنے اصلی مقام پر پہنچ جاؤ گے
جہاں سے تمہاری نئی زندگی شروع ہوجائے گی۔البتہ لکھنے پڑھنے
کا کاروبار ہوگا''۔

(دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ رئیس التحریر۔تاریخ ڈوگرہ دیس۔ص:۱۱۱۷)

نرگسؔ کے برادرِ اصغر گیان چند دیوان اُن دنوں اخبار ''رنبیر'' جموں کے

منیجر تھے جن کی تحریک پر آپ نے پرانی منڈی جمّوں میں ''دیوان پریس'' کے نام سے اعلیٰ پیمانہ پر ایک پرنٹنگ پریس قائم کی۔ اس چھاپ خانے کی رسمِ افتتاح ۱۲ جون ۱۹۳۹ء کو انجام دی گئی ۔ دیوان گیان چند کے ساتھ بلدیو پرشاد شرما کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہی کے ذریعہ شرما موصوف کی ملاقات نرگس سے ہوئی جو ان کے تجربۂ اخبارنویسی کا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ لہذا انھوں نے جمّوں سے ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار شائع کرنے کی تجویز پیش کی جو شرما جی نے قبول کر لی۔ بالآخر اپریل ۱۹۴۰ء کو ہفتہ وار چاند کی رسمِ افتتاح ہوئی اور یہ اخبار دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ چاند کے کچھ سال بعد نرگس نے ''پریم جمّوں'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ بھی جاری کیا جو زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ تاہم اس رسالے نے اگست ۱۹۴۷ء تک عوام کی ادبی خدمات انجام دی۔ نرگس ایک عالی ظرف اور سنجیدہ ادیب تھے۔ آپ ایک کثیرالاحباب اور فراخ دِل شخصیت کے مالک تھے۔ عام لوگوں سے آپ کے رابطے خوش اخلاقانہ ہوتے تھے۔ آپ کی شخصیت میں وہ کشش تھی کہ جو بھی ایک بار مل لیتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ نرگس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ جسے ایک بار دوست کہہ دیا اس کے ساتھ عمر بھر وضع داری نبھاتے رہے۔ اُن کے پیش کردہ ادب کی پاکیزگی پر اُن کے ذاتی کردار کی بلند معیاری کی چھاپ نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت پر یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ

''ایک اچھا انسان ہی اچھا قلمکار ہو سکتا ہے''۔

(کمار راجہ۔ چاند شمارہ جون ۲۶۔۱۹۷۲ء (اداریہ)۔ص ۲۔۱۱)

۱۹۴۷ء سے پیشتر آپ کے تجربات ومشاہدات نے دیہاتی اور پہاڑی علاقوں کے غریب عوام کے استحصال کو جس شدّت سے محسوس کیا اُسے ''دکھیا دیس''، ''سندیسہ'' اور ''پردیسی پریتم'' وغیرہ افسانوں کے مجموعوں کی شکل میں پیش کر دیا۔ یہ

تمام کہانیاں ڈوگروں کے کلچر پر مُبنی ہیں جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ سب کہانیاں مولا رام کوٹی کے نام سے آپ کے ہفتہ وار اخبار ''چاند'' میں شائع ہوتی رہیں اور بعد میں انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان افسانوں کے بعد جانکی، نرملا اور پاربتی جیسے ناول یکے بعد دیگرے عوام تک پہنچے۔ یہ سب ناول بھی ڈوگرہ کلچر، رسم ورواج اور اس دیس کی دیہاتی، شہری زندگی پر کے نادر نمونوں کو سمیٹے ہوئے ہیں جو پریم منوہر کے جامے میں قسط وار اخبار ''چاند'' میں شائع ہوئے پھر وہ پریم منوہر کے نام سے جانکی، نرملا اور پاربتی ناولوں کی شکل میں منظر عام پر آئے جن میں سب سے زیادہ مقبولیت ''پاربتی'' کو حاصل ہے۔ ان ادبی تخلیقات کے علاوہ علم التواریخ کے متعلق بھی نرگس کی متعدد کتابیں ہیں۔ گلاب سنگھ، زورآور سنگھ (اُردو، ہندی)، میاں ڈیڈو، گلاب چرتر اور تاریخِ ڈوگرہ دیس جمّوں وکشمیر''۔

(دلجیت ورما۔ نرسنگداس نرگس کی صحافتی خدمات۔ ص:۱۳۔۱۵)

نرسنگداس نرگس کو اپنی ادبی اور صحافتی خدمات کے سلسلے میں ریاست گیر سطح پر ہی نہیں بلکہ ملک گیر سطح پر زبردست حوصلہ افزائی اور قدردانی نصیب ہوئی۔ دریائے چناب پر بند کے افتتاح کے موقعے پر نرگس کو اپنی نظم سُنانے کے لئے گورنر پنجاب کی طرف سے ۲۵ روپے بطور انعام ملے تھے۔ یہ حوصلہ افزائی اُن کے تخلیقی جوہر کی مہمیز کے لئے بے حد موثر محرم ثابت ہوئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی انہیں ''تاج پوشی'' کے عنوان سے کُل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے ایک سرٹیفکیٹ دیا۔ یہ مشاعرہ جمّوں میں منعقد ہوا تھا۔ تاریخ ڈوگرہ دیس نرگس کا قلمی شاہکار ہے جس پر انھیں مہاراجہ کرن سنگھ کی طرف سے انعام وعطیہ ملا تھا۔ نرگس کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ تاریخِ ڈوگرہ دیس کی طرح ہی تاریخِ کشمیر دیس بھی اُردو اور ہندی میں مکمل کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی پنجابی اور ڈوگری نظموں کو کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی

ایک اورآخری خواہش یہ تھی کہ ان کی راکھ جمّوں کے ندی نالوں میں بہادی جائے۔نرگسؔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء سنیچروار ساڑھے نو بجے صبح اپنی رہائش گاہ واقع چاند نگر جمّوں میں انتقال کر گئے۔وفات کے دن صبح سیر کرنے کے بعدانھوں نے غسل کیا اورواپس جب ڈرائنگ روم میں پہنچے تو انھیں یکا یک دِل کا دورہ پڑا اوراس دارِفانی سے عالم بقا کو روانہ ہوگئے۔وفات کے وقت اُن کے چھوٹے بھائی جی سی دیوان مدراس گئے ہوئے تھے جوخبر سُنتے ہی بذریعہ ہوائی جہاز جمّوں لوٹ آئے۔آپ کے ارتحال پر ریاستی اخبارات وجرائد نے ماتمی قراردادیں شائع کیں اورموقر سیاسی،سماجی اورادبی شخصیات نے خراجِ عقیدت پیش کیا جن کی جھلکیاں اس طرح ہیں۔

''نرگسؔ کی موت سے ریاستی صحافت میں جوخلا پیدا ہوا ہے اس کا بہت جلد پُر ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے''۔

(روزانہ سندیش جمّوں)

"A part from being a powerful journalist Mr.Nargis was also an able short story writer and poet. For the past few years he was concentrating on research on the history of Jammu and Kashmir and had compiled two books on history which provide ample material to the historian for their study and analysis. Mr. Nargis also contributed much to enrich the literary and cultural life of Jammu. He also took active part in political and social activities. He was admired not only as a doyen of the press works but also had the rare qualities of head and heart."

(Kashmir Times Jammu, November 18, 1973)

''نرگسؔ صاحب ریاست کے سماجی ،سیاسی اورعوامی حلقوں میں مشہور اورشہرۂ آفاق ہستی تھے۔آپ ایک مشہورادیب ،شاعر، کہانی کار اور اخبارنویس تھے جنھوں نے ریاست بھرمیں اہم مقام حاصل کیا تھا ۔انھوں نے ڈوگرہ دیس کی تاریخ قلمبند کرکے ایک ایسا کام کیا ہے جس سے اُن کا نام مدتّوں تک روشن رہے گا''۔

(ہفت روزہ ریفارمر،جمّوں)

''آج ہماراوطن ایک بلندفکرصحافی ،ایک خوش فکرشاعر،ایک محقق ، تاریخ دان اورخزینۂ علم وادب کے گوہرغلطاں سے خالی ہوگیا ہے ''۔

(نشاطؔ کشتواڑی)

۱۹۱۵ء میں جبکہ نرگسؔ ابھی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے توانھوں نے اُردوشاعری کا آغاز کیا۔۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد پنجابی اورڈوگری میں غزل گوئی کرنے لگے اور بقولِ ڈاکٹرظہورالدین شاعری کا یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء تک اوڑھنے اوربچھونے کی طرح اُن کی زندگی کاحصّہ رہا۔رفتہ رفتہ اُن کے جوہر کھُلنے لگے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ جذبات اوراحساسات کی ترجمانی ،ان کی غزلوں میں سحرآگیں انداز کرتی رہی۔نرگسؔ صرف وادیٔ حُسن ہی میں محدودرہنا پسندنہیں کرتے ۔اُن کے روبروزندگی کے دوسرے مسائل بھی تھے جوان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔وہ اپنی جدوجہد سے ان مسائل کاحل تلاش کرنے کے لئے حتی الوسع کوشش کرتے رہے۔ بقولِ اقبال نرگسؔ دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔فارسی میں انھوں نے بزرگوں کاایک روزنامچہ لکھا تھا جو بے حدمقبول ہوا۔ بدقسمتی سے نرگسؔ کا کلام غیرمطبوعہ پڑے رہنے کی وجہ سے سارے کا سارا تقریباً ضائع ہوگیا ہے۔تاہم اُن کا کلام کا یہ نمونہ بمشکل ہاتھ آگیا ہے

دِل زور پرور نگاہیں شرابی ہے تعمیر کیوں ہم عنان خرابی
یہ کرنوں سے باریک اُن کے گیسو یہ شعلے سے چہرے پہ شانِ شہابی
ہے ناکامیوں میں حیاتِ محبت میرے عشق کو زہر ہے کامیابی
سکونِ جگر کو ہے پیغامِ شورش نگاہوں کی چہروں تک باریابی
تجھے دیکھ لیتا ہے ہر شے میں زاہد نہیں غیر زیب یہ بے حجابی
شبِ وصل کو بھی نہ محروم کردے میری پست جرأت تیری زُودخوابی

(نرسنگداس نرگس کی صحافتی خدمات۔دلجیت ورما۔ص:۱۶۔۱۸)۔

نظم..... ''آج کی رات''

اور.....

اور میں کیا کہوں۔؟
یہ کہ تُم آج کی رات بھی.....
میرے پاس رہ جاؤ دیکھو سا جن۔۔۔
نمناک ہوائیں کہہ رہی ہیں
دیکھو دیکھو موسم بدل رہا ہے
اور میں اکیلی ہوں
میرے پاس کوئی نہیں
سب کے سب چلے گئے ہیں
تُم آئے ہو تو رہ کر جاؤ

(پریم جمّوں ستمبر ۱۹۴۵ء۔ص:۱۱۔ڈاکٹر ظہورالدین)

نثری نظم.....غیر جانبداری
ہر ایک سے مِلو

اُسے سُنو اور لوگوں کو سُناؤ
پھر جو وہ کہے
اُس پر اپنی رائے قائم کرو
بلا خوب و لحاظ کے
کہ دُنیا کیا کہے گی
بات بات پر اچھا کہنے والے
اور خامیوں کو بھی خوبیاں گننے والے
پرلے درجے کے نادان دوست ہوتے ہیں
اُن سے وہ دانا دشمن بدرجہا اچھا ہے
جو بغیر لگی لپٹی کے بات کہے
تم اچھا کام کرو تو تعریف کرے
اگر غلط راستے پر جاؤ تو روک لے
پہلے دیکھو تو سہی کہ وہ کیا کہتا ہے
بغیر دیکھے سُنے تڑپ اُٹھنا
تدبّر اور دانائی نہیں۔

(پریم منوہر، غیر جانبداری، ہفتہ وار چاند جمّوں جلد ۲۶ شمارہ ۲، ۲۲ اپریل ۱۹۶۲ء۔ ص۔ ۱۱)

جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ نرگس نے پنجابی اور ڈوگری میں بھی شاعری کی جو کافی عمدہ ہے۔ ۲۰۱۵ء سے ۱۹۴۴ء تک کی شعری تخلیقات ہفتہ وار ''چاند'' اور ماہنامہ ''پریم'' میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اپنی تمام تر توجّہ اُردو فکشن نگاری کی جانب مبذول کرتے ہوئے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ زندگی کے آخری حصّے میں بڑے مورخ کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے اور زبردست

نیک نامی حاصل ہوئی۔

"Nargis was a man of Multidimentional personality. He was a great poet, a fiction writer, a historian and a journalist of immense repute and on top of all a writer of Urdu, Hindi,Dogri and Punjabi languages simultanously".

(Development of Urdu Languate & Literature in the Jammu region.P.396).

نرگسؔ کے فرزند اقبال نرگسؔ بھی ایک اچھے شاعر تھے اور اقبال تمنائیؔ کا تخلص رکھتے تھے۔ اقبال نرگسؔ اگست ۲۰۰۷ء میں انتقال کر گئے جبکہ ''چاند'' تقریباً ۲۰۰۲ء میں بند ہو گیا تھا۔ اس وقت اقبال نرگسؔ کے فرزند دیوان کیلاش ''چاند آفسیٹ پریس'' چلا رہے ہیں جس کو اب بڑی برہمنہ جمّوں میں منتقل کیا جا رہا ہے اور اس چھاپ خانے کا کام اچھی طرح جاری ہے ۔ نرگسؔ کے دو چھوٹے بھائی دیوان چند اور گیان چند دیوان بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ گیان چند ملک راج صراف کے اخبار ''رنبیر'' کے منیجر بھی رہے جبکہ دیوان چند دیوان ایک ہفتہ وار ''شیرِ ڈوگر'' کے مدیر اعلیٰ تھے جو اپریل ۱۹۹۲ء میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کرنے کے بعد اُن کی رفیقۂ حیات شریمتی سورن لتہ اپنے شوہر کے اس اخبار کو باقاعدہ نکالتی رہیں اور ان کے ارتحال کے ساتھ ہی یہ اخبار بھی بند ہو گیا ہے ۔ اُن کے فرزند وِکرم دیوان جو میرے ایک قریبی دوست ہیں، کا کہنا ہے کہ سورن لتہ دیوان نے گلاب نامہ کا ہندی ترجمہ بھی کیا تھا۔ الغرض دیوان خاندان علم وادب کا ایک قدیم اور اہم گہوارہ رہا ہے جس کی گرانقدر اُردو ادبی خدمات کو نظر انداز کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔

نرگسؔ کی کہانیاں اولاً چاند اور پریم میں شائع ہوتی رہیں پھر انھوں نے

انھیں ''دُکھیادیس'' اور ''سندیسہ'' نام کے دومجموعوں کی صورت میں زیورِطبع سے آراستہ کروایا۔اُن کا تیسرا مجموعہ ''پردیسی پریتم'' کے نام سے چھپا جودراصل ان کی تالیف ہے اوراس میں خودنوشتہ ایک کہانی شامل کی ہے۔ان تین مجموعوں سے راقم کوصرف آخرالذکر مرتب کردہ افسانوی مجموعہ ہی دستیاب ہوسکا جوستمبر۱۹۴۵ء میں چاند پریس جمّوں سے شائع ہوا ہے۔اس میں محجوبہ یاسمن، پنڈت پریم ناتھ پردیسی، عشرت کاشمیری،عزیز کاشؔ،اخگرعسکری،شیخ منظورالٰہی کوثرؔ سیمابی،موہن یاور،کشمیری لال ذاکرؔ، جگدیش کنول ،فضل حسین کیف اسرائیلی،عبدالحمیدنظامی ، صاحبزادہ محمدعمر(نورالٰہی)،ٹھاکرجگن ناتھ پونچھی،مرزامحمدیعقوب گورگانی،شیخ عبدالعزیزعلاتی، دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ، دولت رام گُپت اوراقبال تمناؔئی کے تحریرکردہ اُنیس افسانے پڑھنے کے لئے موجود ہیں۔اس تالیف کونرگسؔ نے دیاکرشن گردشؔ کے نام منسوب کیاہے جواس وقت کے ایک مقتدرمقامی صاحبِ قلم تھے۔چھپن صفحات پر چھاپی گئی اپنی اس تالیف میں نرگسؔ نے ان تمام کہانی کاروں کومتعارف کیاہے جن کی کہانیاں اس میں شامل ہوئی ہیں۔چنانچہ وہ تحریرکرتے ہیں کہ:

> ''اگست۱۹۴۵ء کی حسین دوپہرتھی کہ جب میرے دیہاتی افسانوں کااولین مجموعہ ''دُکھیادیس'' پہلی بارتیارہوکرمیرے سامنے آیا۔میں نے اسے دیکھا،پڑھااورایک طرح کالطیف پیاربھی کیا۔آپ یقین کریں کہ اس نوع کے پیارسے کچھ وہی طبیعتیں لطف اندوزہوسکتی ہیں جواپنے افسانوں کواپنی اولادسمجھتی ہوں کیونکہ ایک طبعزادافسانہ فن کارکی کاوش وکاشیں اورمحنت وانہماک کے بعداس کی اولادبن جاتاہے۔بہرکیف اس پیارکے دوران میں نے سوچاکہ میرے وطنِ عزیزمیں بھی ایسے اہلِ قلم اوراہلِ علم حضرات موجود ہیں جونہایت سلجھاہواعلمی وادبی مزاج رکھتے

ہیں ۔بہترین ادیب ہیں،بہترین شاعر ہیں لیکن گوشۂ گمنامی میں پڑ کر اپنی خداداد ادبی صلاحیتوں کو بیکار بنا رکھا ہے ۔ان سے کچھ کام نہیں لے رہے اور اگر چند کے بھی رہے ہیں ۔تو ان کی کوئی پوچھ نہیں ۔میرا دِل کہتا ہے کہ میرے وطن کے گمنام افسانہ نویس ،مضمون نگار، شاعر اور نقاد اگر پوری دلچسپی اور توجہ سے لکھنا اور پڑھنا شروع کر دیں تو ریاست جموں وکشمیر بھی علمی،ادبی اور فنی اعتبار سے دہلی ،لکھنؤ ،حیدرآباد اور لاہور کی طرح ایک علیحدہ اور مستقل اسکول قرار دی جاسکتی ہے ۔صرف شوقِ زندہ وذوقِ پائندہ کی ضرورت ہے ۔اسی ذوق وشوق میں خوشگوار حرارت اور ایک جوش پیدا کرنے کے لئے اگست کی مذکورہ حسین دوپہر کو میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اپنی پہلی فرصت میں ایک ایسی کتاب مرتب کروں گا جس میں ریاست جموں وکشمیر کے نامور افسانے درج ہوں گے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہوگی اور میری تمناؤں کے مطابق علم وادب کی ترویج وفروغ میں منہمک ہوجائیں گے۔ چنانچہ اسی تڑپ اور شدید احساس کا نتیجہ ہے کہ آپ کی خدمت میں وطنی فنکاروں کے زندہ جاوید ادب پاروں کا دلپذیر مرقع پردیسی پریتم پیش کیا جاتا ہے۔ پڑھیئے اور داد دیجئے ''۔ (ص۔ر۔س)

نرگس کی افسانہ نگاری پر گُلزار احمد فدا، مدیر پریم جمّوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''جس کام کو منشی پریم چند نے شروع کیا تھا۔ اس کو نہایت سلیقے اور چابکدستی سے پورا کرنے والے موجودہ اُردو افسانہ نویسوں میں ڈاکٹر اعظم کریوی، مہاشہ سدرشن ،علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، سہیل

عظیم آبادی اور مولا رام کوٹی (نرگس) ہیں''۔

(دُکھیا دیس ماہانہ پریم جمّوں۔جلد۳۔شمارہ۵۔ستمبر۱۹۴۵ء۔ص:۸)

پہلے نرگس کے شعور کی بیداری کے آثار رامکوٹ جاگیر کے علاقے کے عوام کی زندگی کے افسانوں کی صورت میں سامنے آئے۔ترقی پسند تحریک کشمیر کی طرح جمّوں کے لکھنے والوں اور خاص طور پر شاعروں اور افسانہ نگاروں میں بھی اس زمانے تک مقبولیت حاصل کر چکی تھی چنانچہ نرگس کے افسانوں کے موضوع اور کردار اسی نواحی زندگی سے چُنے گئے ہیں اور ان کو پیش کرنے میں حتی الامکان حقیقت شعاری سے کام لیا گیا۔تاہم ان کے مخصوص تاثرات نے کہیں کہیں مبالغہ کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔

''دُکھیا دیس'' میں نرگس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے ذاتی تجربات ومشاہدات کا عکس ہے اور یہی کہانیاں لطافت اور حقیقت کے امتزاج کے بعد بہترین سبق آموز افسانے بن گئے ہیں۔نرگس کی یہ کہانیاں دیہاتی غریبوں کی آہوں، سِسکیوں، چیخوں اور آنسوؤں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔جہاں چاروں طرف موت کی حکمرانی ہے، ہُو کا عالم ہے، تاریکیاں ہیں، خوف وہراس سے انسانیت تلملا رہی ہے لیکن ان کی جان نہیں نکلتی۔مولا رام کوٹی نے اپنے دُکھی دیس کی جو حالت دیکھی وہی ''دُکھیا دیس'' میں بیان کر دی ہے۔یہ کہانیاں زندگی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہیں۔افسانہ نگار نے ہندوستان کی سیاسی بیداری کے خاص پہلوؤں کی بھی پُر اثر عکاسی کی ہے۔مولا کا اندازِ بیان، اسلوبِ نگارش اور جذبۂ خدمتِ علم وادب اپنے جوبن پر ہے۔

''پردیسی پریتم'' افسانوی مجموعے میں نرگس نے ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے ایسے افسانوں کو جگہ دی ہے جن میں ریاستی عوام کے مصائب وآلام

کی حقیقت پسندانہ عکاسی ہوئی ہے۔اس کتاب نے ادبی دُنیا میں ایک تہلکہ مچاتے ہوئے غیر منقسم ہندوستان کے ادباء وشعراء کو یقین دلایا کہ ادبی اور فنی اعتبار سے جمّوں وکشمیر حقیقتاً ایک الگ ادبی اسکول کہلانے کا حقدار ہے۔ یہ افسانے موضوع اور زبان وبیان کی خوبصورتی کے اعتبار سے ہر صاحب ذوق قاری کے لئے باعثِ دلچسپی بنے۔زیر بحث کتاب میں نرگس کا جو افسانہ ''اپنی کہانی'' کے عنوان سے شامل ہوا ہے وہ تیرہ صفحات پر محیط ہے۔اس افسانے کی ابتداء اس طرح ہوئی ہے:۔

''مدّت کی باتیں ہیں،کوئی پچاس برس پہلے کی۔میں اس وقت جوان تھا۔طاقت اور ہمت دونوں میری لونڈیاں تھیں اور گھر سے بھی امیر اتنا کہ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔اپنے علاقہ میں میری دھاک تھی۔میں نے تین شادیاں یکے بعد دیگرے کی تھیں اور اپنی تینوں بیویوں کو علیحدہ علیحدہ گاؤں میں جہاں کہ میری اراضی تھی مالک بنا رکھا تھا اور لُطف یہ کہ تینوں نے ایک دوسرے کو بھی نہ دیکھا تھا۔مدتوں یہ راز چھُپا رہا کہ میری کسی بیوی کو بھی یہ پتہ نہ لگ سکا کہ میری کوئی اور بیوی بھی اس کے علاوہ ہے۔بڑا مزا تھا۔اس وقت جس گھر جاتا خوب آؤ بھگت ہوتی اور تینوں بیویاں اپنے اپنے انتظار میں ساعتیں شمار کرتیں''۔(ص:۱۹۵)۔

افسانہ نگار نے اپنی پہلی بیوی کا نام پریم دیئی لکھا ہے جو ایک پہاڑی نمبردار کی لڑکی تھی۔اسی پہاڑی علاقہ میں فاریسٹ گارڈ تعینات ہونے کے سبب نمبردار کے گھر میں ٹھہرا اور وہیں اس کی لڑکی پر فریفتہ ہوگیا جسے اُس نے بھگا کر اپنے گھر کے نزدیک اپنی ملکیت کے گاؤں میں رکھا جہاں وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔افسانہ نگار کی تعیناتی ایک اور علاقے میں ہوئی جہاں وہ گورجُو نامی ایک بوڑھے آدمی کی بیوی پر فریفتہ ہوگیا۔اُس بوڑھے کی وفات کے بعد گورجو کو دوسری بیوی بنا دیا

اوراُسے بھی اپنے گھر لانے کے بجائے اُسی علاقے میں رکھا۔ اِدھراس کے والدین نے اس کی شادی رآنی کے ساتھ رچائی اوراس طرح وہ تین بیویوں کا شوہر بن گیا۔ پھراس کے ماں باپ یکے بعد دیگرفوت ہوگئے اس لئے اس پریشاں حالی میں اس نے محکمہ جنگلات کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک دن پریم دیئی کے ہاں پہنچا جہاں اس کا دوست خوش گپیاں ہانک رہا تھا۔ میاں بیوی میں تُو تُو میں میں ہوگئی تو شراب کے نشے میں افسانہ نگار نے اپنی بندوق کی گولی سے پریم دیئی کا قتل کردیا اوراس کی چارسالہ بچی مورتُو کو اپنے دوست کے پاس رکھ کر وہاں سے چلدیا۔ دوسری اور تیسری بیویوں کا انجام بیان کرتے ہوئے نرگسؔ لکھتے ہیں کہ:۔

''ایک سال اسی طرح گذر گیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ گورجو کے اطوار بھی بدل گئے ہیں۔ آخرا یکدن یہ سُن ہی لیا کہ گورجو مجھے جل دے کر پٹواری کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔اسی طرح رہتے کتنی مُدت ہوگئی کہ میرے ہاں ایک رات ڈاکہ پڑا۔ میں اپنی بہن کے ہاں گیا ہوا تھا۔ڈاکو رانی کو ہلاک کر گئے اور سب کچھ لوٹ لے گئے۔نقدی زیور جو کچھ بھی تھا سبھی کا سبھی لے گئے۔ میں گھر آیا تو برداشت نہ کرسکا۔ پولیس کو یونہی تفتیش کرتے چھوڑا۔ ایسا بھاگا کہ یہاں آ کر رکھی کیش ہردوار دم لیا۔ اب میں دس سال سے یہاں دُنیا کے جھگڑوں سے آزاد لیکن جب کبھی خیال آتا ہے پچھلی باتوں کا تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ اب کچھ دنوں سے مورتو یاد آنے لگ گئی ہے۔ میری بچّی میری کہانی کی ایک ہی یادگار اب جوان ہوچکی ہوگی معلوم نہیں۔ اسے کوئی بیاہتا بھی ہے یا نہیں یا یونہی خراب ہوتی ہے''۔

(ص:۲۰۶ے۲۰۷ء)۔

اس طرح نرگسؔ نے متماول لوگوں کی عیش کوشی اور جنسی استحصالی کا ایک

خوبصورت نقشہ کھینچتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی کسی بھی چیز کا لالچ کرنا امن وسکون کے لئے سُم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بھی کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی بلکہ گمراہی سب سے بڑی بیماری ہوتی ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ نرگسؔ نے اپنے آپ کو کیسے پیش کیا ہے۔''خاکسار کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔یہ ادب کی خدمات کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے۔''دُکھیا دیس'' پیش کر چکا ہوں۔اب ''پردیسی پریتم'' حاضرِ خدمت ہے۔اس کے بعد''سندیسہ'' عنقریب پیش کرنے والا ہوں۔''اپنی کہانی''جو اس مجموعہ میں شامل ہے یہ دُکھیا دیس سے بچھڑی ہوئی ہے اور ایسی ہی بچھڑی ہوئی لاتعداد کہانیاں اور بھی ہیں جو'غم نصیب دیس'' کی صورت میں بہت جلد مطلعٔ اشاعت پر آرہی ہیں۔اقبال تمنائی میرا لڑکا ہے چونکہ نیا نیا لکھنا شروع کیا ہے اس لئے ابھی میری تمناؤں کے مطابق نہیں۔اگر شوق سے اچھی اچھی کتابیں پڑھتا رہا تو امید ہے کہ ایک دن اچھا ہو جائیگا۔اس کا افسانہ''نوکری'' ہے جو اس کتاب کے آخر میں درج ہے۔نوکری میں اس نے بڑے آدمیوں کی مجبوریوں کی طرف عوام کی توجہ دلائی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ غلام ہندوستانیوں کی غلام ذہنیتیں غلامی کی کس درجہ خُوگر ہو چکی ہیں کہ ایک معمولی نوکری کو ہی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھتی ہیں اور جب یہ نصب العین پورا ہو جائے تو جانتی ہیں کہ زندگی سپھل ہوگئی''۔(پردیسی پریتم۔ص:م۔ن)۔نرگسؔ کے افسانوی مجموعے 'دُکھیا دیس ''اور''سندیسہ'' بالترتیب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں یکے بعد دیگرے طبع ہوئے تھے۔

افسانہ نگاری کے فن پر اپنی مکمل گرفت ثابت کرنے کے ساتھ ہی ساتھ نرگسؔ نے ناول لکھنے میں بھی کمال دکھایا جس کا ثبوت اُن کے لکھے ہوئے ناولوں ''جانکی،نرملا اور پاربتی میں ملتا ہے۔یہ سب ناول بھی ڈوگرہ کلچر،رسم ورواج اور ڈوگرہ دیس کی دیہاتی اور شہری زندگی کے نادر نمونوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

نرگس کے ان تین ناولوں میں سے صرف نرملا اور پاربتی ناول ہی میرے ہاتھ لگے جو بالترتیب اپریل ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۲ء میں پریم منوہر کے قلمی نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ تینوں ناول پہلے قسط وار 'چاند' اخبار میں چھپتے رہے جن کی عوامی مقبولیت کے پیش نظر انھیں باضابطہ کتابوں کی شکل دی گئی۔ ''پاربتی'' جو ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے کو مصنف نے ''دیہات کی اُن مظلوم روحوں کے نام (منسوب کیا ہے) جن کے دِل زیر نظر کہانی میں دھڑک رہے ہیں''۔ اس ناول کا دیباچہ گیان چند ناز پڑولوی نے پٹرول (کٹھوعہ) میں ۲۱ مئی ۱۹۶۲ء کو قلمبند کیا ہے جس کا آخری اقتباس اس طرح ہے۔

> ''مختصر، زبان نہایت سلیس، زُود فہم اور الفاظ کی سادگی سے انتہائی دلکش اور خوشنما ہے اسلوبِ بیان بھی جدّت نُما اور جدید طرز کے ادبی ذوق کا حامل ہے۔ چنانچہ طرزِ ادائیگی کا ماخذ بھی نرگس کے فنِ تحریر کا ایک معجزہ ہے۔ غرضیکہ نفاست کے اعتبار سے اور افسانہ نویسی کی معیاری قدروں کے پیش نظر ناول آخر تک اپنی دلکشی اور رومان کو ختم نہیں کر سکا ہے جس نے اس ادبی پیش کش سے اپنے ناظرین کرام کو اپنا ممنون بنا لیا ہے''۔ (ص: ۸)

''پاربتی'' شہر کے ایک غریب خاندان کے نوجوان سُندر لال کی زندگی کی کہانی ہے جو اپنے خاندان کی پرورش کے لئے کالج کی تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے پرتاپ گڑھ کے گاؤں میں پنچایت انسپکٹر کی اسامی ملتی ہے، جہاں ہری رام کی نوجوان لڑکی پاربتی سے اس کا رومان شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض اچھے نفسیاتی مواقع بھی آجاتے ہیں۔ نرگس جی اپنے اطراف کی دیہاتی زندگی سے بخوبی واقف ہیں اور اسے حتی الامکان صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک المیہ اس طرح بن گیا ہے کہ سندر لال کی شادی شہر میں ایک

انجینئر کی لڑکی سے ہوجاتی ہے اور پاربتی جو اس کی وجہ سے بدنام ہوگئی تھی۔ گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے بیاہ دی جاتی ہے۔ یہ ہماری سماجی زندگی کے مسائل ہیں اور ملتے جُلتے ماحول میں بارہا دہرائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پریم چند کے سماجی ناولوں کو ایک خصوصیت حاصل ہے۔ سندر لال اور پاربتی کی حیاتِ معاشقہ پر بھی پریم چند کے مخصوص انداز کا اثر ہے۔ پاربتی کے کردار کو بلند رکھنے کی جو کوشش مصنّف نے کی ہے، اس کو دیکھ کر پریم چند کی بیوہ ذہن میں گھومنے لگتی ہے۔ سُندر لال کی محبت میں جو مصیبتیں اس پر پڑتی ہیں وہ نہایت صبر اور مستقل مزاجی سے برداشت کر لیتی ہے۔

پاربتی کے ناول کو پریم منوہر نے لکھ کر جہاں اُردو ادب اور زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے وہاں دیہات سُدھار کی تحریک کو بھی تقویت دی ہے جس میں اپنے دیس بالخصوص ڈوگرہ پہاڑی دیہات اور قصبوں کے رہن سہن، سماج اور معاشرے کی صحیح تصویر کھینچ کر رکھی ہے۔ پاربتی میں پریم منوہر کی طرزِ تحریر انوکھی، بالکل نئے اور اچھوتے نرگسی انداز کی حامل ہے۔ زبان سادہ اور مکالمہ بندی کمال پر ہے۔ پاربتی پریم منوہر کا ایک ایسا شاہکار ناول ہے جس میں زندگی کی تمام حقیقتیں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں''۔

''نرملا'' ناول بھی پریم منوہر کے قلمی نام سے ہی ۲۰۰ صفحات پر چاند پبلشنگ ہاؤس جمّوں سے شائع ہوا ہے۔ نرسنگداس نرگسؔ نے اس کا انتساب ''ڈوگرہ دیس کے کلچر کے نام'' کیا ہے۔ اس ناول سے متعلق جانکاری فراہم کرتے ہوئے نرگسؔ نے تحریر کیا ہے کہ:۔

> ''نرملا کی کہانی ہفتہ وار چاند میں باقساط شائع ہوچکی ہے۔ اب اسے اکثر دوستوں کی فرمائش پر کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے اور اُمید ہے کہ یہ کہانی بھی میری لکھی ہوئی پہلی کہانیوں کے مجموعہ ''دُکھیا دیس''، ''سندیسہ'' اور ناول ''پاربتی'' سے کم پسند نہیں کی جائے گی۔ میں نے

ہر چند کوشش کی ہے کہ افسانہ پر حقیقت کا گمان ہو اور ''نرملا'' کی کہانی زندگی سے دور نہ رہے۔ کیونکہ یہ کہانی میرے ذاتی مشاہدات کا عکس ہے اور اس کا ہر موڑ اگر سو فیصد نہیں تو اسی فی صدی سچائی پر مُبنی ہے صِرف نام اور مقام بدل دیئے گئے ہیں۔ اس کہانی میں اُن لوگوں کی زندگی چلتی پھرتی دکھائی گئی ہے اور رسم ورواج نمایاں کئے گئے ہیں جو شہروں سے دور پرے کوہساروں کے دامن میں جمہوریت اور آزادی کے دور میں بھی پسماندہ کے پس ماندہ ہیں۔ نرملا کی کہانی کہاں تک زندگی کی سچی اور حقیقی تفسیر بن سکی ہے یا اس میں امیر وغریب ، نیک وبدغرضیکہ ہر قسم اور ہر درجہ کی زندگی کی صحیح عکاسی کس قدر ہوسکی ہے۔ اس کا جواب میں اپنے قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں''۔ (ص:۴)

اس طرح سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ نرگسؔ کے ناول دلچسپ ، بامعنی ، بامقصد اور عمدہ تھے۔ ان کی کردار تراشی ، مکالمہ سازی، کہانی کاری جذبات نگاری اور منظر نگاری وغیرہ توجہ طلب اور اُن کی فنکاری کی دلالت کرتی ہے۔

''نرملا'' کے ابتدائی اقتباسات نرگسؔ کی ناول نگاری کے عمدہ نمونے ہیں:۔

''سُندری کوٹ کے نمبردار سُورج کی لڑکی نرملا اپنے صحن میں کھڑی شام کے وقت سامنے پہاڑی پر سے آتے ہوئے مویشیوں کو دیکھ رہی تھی جو کہ صبح سے چرنے کے لئے پہاڑی کی دوسری طرف روز چراگاہ میں لے جاتے تھے۔ اُس نے گوکلؔ کو آواز دے کر کہا'' بھئی مال آرہا ہے۔ تم کہاں ہو؟ تمہیں تو فکر ہی نہیں چھوڑتا۔ ان کے چارے کا بھی کچھ کرنا ہے!''۔

گوکل نے جواب کچھ نہیں دیا لیکن اس کی بجائے نرملا کی نظر ایک جوان پر پڑی جو ڈیوڑھی میں بیٹھا کراہ رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئی کہ اجنبی صورت کہاں سے آگئی۔ اسے کیا تکلیف ہے، کون سے دُکھ درد کی وجہ سے تڑپ

رہا ہے۔ وہ گوکل کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ڈیوڑھی میں آ گئی اور اس نے اجنبی سے پوچھا ''تُم کون ہو اور یہاں کیسے آئے ہو؟''۔
اجنبی تو نرملا کی طرف دیکھتا رہا۔ نرملا کھدّر کی سُرخ قمیض اور سیاہ صُوف کی سُتھن پہنے ہوئے تھی۔ سر پر اُس نے میلا سا رومال باندھ رکھا تھا۔ نرملا نے جب اجنبی کو اپنی طرف گھور کر تکتے ہوئے دیکھا تو کچھ سہم گئی اور دو قدم پیچھے مُڑ کر صحن کے داخلی دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور تحکمانہ انداز میں صحن کی طرف مُنہ کر کے کہنے لگی۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیسے آئے ہو؟''۔ (ص: ۵۔۶)۔

ناول کے آخری دو اقتباس اس طرح ہیں:۔

(۱) ''ماسی کی باچھیں کھِل گئیں۔ پوچھنے لگی ''کیا سچ مُچ میری نرملا زندہ ہے؟''

(۲) ''پندرہ دن کے بعد گرام سیوک، ماسی اور بوڑھا نوکر گوگل شہر جا رہے تھے۔ نرملا اور پرکاش کو حقیقی معنوں میں زندگی کا ساتھ بنتے دیکھنے اور آشیرواد دینے''۔ (ص: ۲۰۰)۔

نرگسؔ ایک بڑے تاریخ نگار بھی تھے چنانچہ تاریخ کے موضوع پر ان کی کتابوں سے گلاب سنگھ، زورآور سنگھ، میاں ڈیڈو، گلاب چتر راور تاریخِ ڈوگرہ دیس کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور انھوں نے اپنا لوہا منوانے میں پوری کامیابی حاصل کی۔ ''گلاب سنگھ'' کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا جس کا انتساب ''شمالی ہندوستان کے اُن جانباز سپوتوں کے نام (ہوا ہے) جنھوں نے اپنے پرانوں کی آہوتی دے کر ہندوستان کی سرحدیں ہمالیہ کے اُس پار وسطِ ایشیا تک پہنچائیں''۔ چوتھا ایڈیشن (جو میرے پیشِ نظر ہے) نومبر ۱۹۶۵ء میں شری اقبال نرگسؔ جنرل منیجر چاند پبلشنگ ہاؤس جمّوں نے چاند پریس جمّوں میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ یہ جلد بند کتاب ۲۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے آخیر میں نرگسؔ کی گیارہ

تصنیفات کی فہرست درج ہوئی ہے جبکہ ابتدائی دوصفحات پر مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ گورنر جمّوں وکشمیر کی تصویر بمعہ پیغام چھاپی گئی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

''آج سے چھ سال پہلے ستمبر ۱۹۵۹ء میں تریخ جمّوں وکشمیر ۱۹۷۶ء لغایت ۱۸۵۷ء موسومہ ''گلاب سنگھ'' شائع کی گئی تھی اور آج تک اس کے دوایڈیشن اُردو اور تیسرا ہندی میں اشاعت پا کر ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اب چوتھا ایڈیشن پہلے سے مختلف سائز میں پیش خدمت کر رہا ہوں۔ آنجہانی گلاب سنگھ کی زندگی کا خاکہ پیش کرنے میں کسی بھی جگہ بخل یا مبالغہ آمیزی سے کام نہ لیا جائے اور ان کی زندگی کے وہی خدوخال عوام کے سامنے پیش کئے جائیں جو انھیں فطرت سے میّسر آئے تھے۔ اس قسم کی تصویر کشی کا فرض یقیناً مشکلات کے احساس اور اُن پر قابو پانے کے عزم کے بغیر انجام دینا محال است وجنوں کے مترادف تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اپنے آپ کو رعایا کا روحانی باپ سمجھتا تھا۔ ایک باپ کو جتنی محبت اپنے بیٹوں سے ہوسکتی ہے، اتنی ہی محبت اُسے ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں طور پر تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے لئے ریاست کے خودمختار حکمران کی حیثیت میں ہندوستان کے اس شمالی گوشہ میں مساوات، اخوّت اور انصاف کی وہ روایات قائم کیں جن پر اس سرزمین سے تعلق رکھنے والوں کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے''۔

اس کتاب کو ۱۵۶ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس میں گلاب سنگھ سے پہلے کی تاریخ کا بھی ایک اچھا خاکہ دیا گیا ہے۔ کُل ملا کر یہ نرگس کی تاریخ نویسی کا پہلا اور اہم قدم ثابت ہوا۔

''گلاب سنگھ'' کی اشاعت کے چند ہی ماہ بعد نرگس کا کتابچہ ''گلاب چرتر'' مرتب وشائع ہوا۔ ۱۳۶ صفحوں والے اس پیپر بونڈ کتابچے میں بھی گلاب سنگھ ہی کے متعلق اہم جانکاریاں درج ہوئی ہیں۔ زیرِنظر کتابچے کا انتساب شتابدی کمیٹی کے نام ہوا ہے ''جس نے بھارت کی سرحدیں وسط ایشیاء سے ملانے والے اُنیسویں صدی کے مرتب سیاستدان اور فاتح اعظم مہاراجہ گلاب سنگھ کی شتابدی منانے کا ڈوگرہ دیس کو پیغام دیا''۔ ''ابتدائیہ'' میں لکھا گیا ہے کہ

> ''کوئی چار پانچ ماہ ہوئے۔ میں نے کتاب موسومہ'' گلاب سنگھ'' شائع کی تھی جو کہ کتابی سائز کے دُگنے سائز پر ہے۔ گویا کہ یہ کتاب اڑھائی صد صفحات پر مشتمل ہے، اصل میں پانچ سو صفحات کی کتاب ہے جس میں پچاس کے قریب عکسی فوٹوز اُنیسویں صدی کی اکثر شخصیتوں کے ہیں۔ سہ رنگے ٹائیٹل کی اُس کتاب میں ریاست جموں وکشمیر کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے خدوخال کو بغیر کسی زیبِ داستان یا بجل کے ہسٹری کی کسوٹی پر پیش کیا گیا اور مقام مسّرت ہے کہ عوام میں'' گلاب سنگھ'' کو بے حد پسند کیا گیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے۔ اب دوسری کتاب'' گلاب چرتر'' کے نام سے ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ پہلی اور دوسری کتاب میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ'' گلاب سنگھ'' میں اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے ڈوگرہ دیس کشمیر، لداخ، تبت اور گلگت چترال وغیرہ کی بدتر حالت اور غلامی کے بھیانک نظارے درج ہیں جبکہ ابھی آنجہانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عروج اور اقبال کی کہانی ہے۔ افغانستان کے انقلاب اور انگریزوں کے پنجاب پر تسلّط کے واقعات درج ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے بھائیوں راجہ دھیان سنگھ

اورسوچیت سنگھ کی سیاست، دانشوری اور بہادری کی مفصل روداد ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھا شاہی کا ہولناک منظر ہے اورطوائف الملوکی کے دردانگیز اورلرزہ خیز دور میں گلاب سنگھ کے خاندان کی ہلاکت اور خودگلاب سنگھ کی لاہور میں سر بازارتذلیل اورگرفتاری کے حالات ہیں۔ رانی جنداں کا فرار اور پنجاب کے آخری مہاراجہ دلیپ سنگھ کی جلاوطنی کے اسباب لکھے گئے ہیں۔علاوہ ازیں دُنیا کے عظیم جرنیل وزیر زورآورسنگھ کے کارناموں اورفتوحات کا مفصل ذکر ہے لیکن ''گلاب چرتر'' میں صرف اُن ہی واقعات اورکارناموں کولیا گیا ہے جوکہ خالصتاً آنجہانی مہاراجہ گلاب سنگھ سے وابستہ ہیں۔اس طرح دونوں کتابیں سوانح حیات کہی جاسکتی ہیں لیکن ''گلاب سنگھ'' ایک مکمل تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔اور''گلاب چرتر'' صرف سوانح عمری ہے جس میں واقعات توسب درج ہیں لیکن مختصرطریق سے''۔(ص:۵۔۶)۔

نرگس کی تیسری تصنیف ''گوریلا جرنیل۔میاں ڈیڈو'' دسمبر ۱۹۶۴ء میں ساٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب گُمٹ گیٹ جمّوں نے ہی طبع کی تھی۔اس کتابچے کی ابتدائیہ میں نرگس نے تحریر کیا ہے کہ

''اُنیسویں صدی کے عظیم گوریلا جرنیل میاں ڈیڈو کی زندگی کے حالات آج تک ڈہاڈی، درویشوں اور جوگیوں کی کنگوں اور سارنگیوں پر ہی لوک گیتوں (ڈوگری باردل) کی صورت میں سُنے جارہے ہیں اورسینہ بہ سینہ چلی آرہی کہاوتیں اس جرنیل کی بہادری اور جانبازانہ کارناموں کی شاہد ہیں۔ڈیڈوجمّوں کی پہاڑیوں سے اُبھرا۔غیر کے غلبہ سے اپنادیس چھڑانے کے لئے اُس نے جہادکیا اورایک بہادرکی موت مرکراپنے نام

کورہتی دُنیا تک امر کر گیا لیکن افسوس کسی مورخ نے ڈوگرہ دیس کے اس سرفروش گوریلے کی داستانِ حیات کو کتابی صورت نہ دی اور آج یہ امر کہانی مختلف الخیال لوگوں کی زبان پر بکھری پڑی ہے۔ایک وہ ہیں جو میاں ڈیڈو کو امپریلزم کا دشمن ،خودداری ،آزادی اور شجاعت کا مجسمہ کہتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اُسے ڈاکو،لُٹیرا اور بھگوڑہ کہہ کر پکارتے ہیں۔اس طرح ڈوگر کے عظیم گوریلے کے متعلق کئی ایک غلط فہمیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔میاں ڈیڈو دیس کی آزادی کے لئے آخری دم تک لڑا۔بھوکا پیاسا رہا۔جنگلوں میں چھُپتا پھرا۔گھر گھاٹ چھوٹ گیا اور اُس کے جانباز ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے لیکن اُس نے بیرونی حکومت کے آگے سر نہ جھُکایا ۔۱۸۰۸ء کی جنگ میں ڈیڈو کی عمر ۲۸ سال تھی۔ڈیڈو اور گلاب سنگھ کا سلسلۂ نسب شاہی خاندان جمّوں والئے جموّں ریاست سے وابستہ تھا۔ ڈوگرہ دیس کے عوام کو جہاں مہاراجہ گلاب سنگھ کی لامثال حب الوطنی اور بے نظیر تدبّر پر فخر تھا۔وہاں وہ میاں ڈیڈو ایسے غیور، جانباز اور سرفروش کو فراموش نہیں کر سکتے جنھوں نے ڈوگرہ کی تقدیر کو اپنی ہڈیوں کے سانچے میں ڈھالا۔کیا صاف،سچا سُچا اور اُن کا پکا انسان تھا''۔

(ص:۱۔۶)

اس طرح ''میاں ڈیڈو'' کا کتابچہ لکھ کر نرگس نے اعتراف کروایا کہ وہ شخصیات پر بھی منفرد انداز میں لکھنے کے فن پر ایک خاص دسترس رکھتے تھے۔ اختصار اور تسلسل اس کتابچے کو دلچسپ اور معتبر بنا دیتے ہیں۔

نرگس کا تاریخی شاہکار اُن کی ضخیم ترین ''تاریخِ ڈوگرہ دیس'' ہے۔ ۱۱۲۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔اس تاریخ میں ڈوگرہ

دیس کی ۲۲ ریاستوں کی تاریخ زمانۂ قدیم سے مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت تک درج ہے۔تعارف نگار پنڈت دیا کرشن نے لکھا ہے کہ۔

''ایڈورڈ گبن (Edward Gibon) کی طرح نرگس نے بھی ماضی کے ایک ناپید سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر وہ گُہر پارے اہلِ علم کو پیش کئے گئے ہیں جن سے موجودہ یُگ کا مورخ قطعی طور پر نا آشنا تھا۔اب ڈوگرہ جانبازوں کی سرزمین کو اگر بھارت کا مورخ قطعی طور پر نا آشنا تھا۔اب ڈوگرہ جانبازوں کی سرزمین کو اگر بھارت کے اہلِ تاریخ خصّص کی صفِ اول میں قدم رکھنا نصیب ہوا تو نرسنگداس نرگس کی بدولت ڈوگرہ بھومی یقیناً نرگس کے اس احسان کو بھی فراموش کرنہیں سکے گی۔نرگس کو اس کاوش کے لئے صدیوں یاد کیا جائے گا''۔

(بلدیو پرشاد شرما۔ہمارا ادب نمبر۔۳۔ص۲۴۴)۔

نرگس نے ''تاریخِ ڈوگرہ دیس'' یکم جنوری ۱۹۵۶ء سے ۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء کے دوران تحریر کی۔مقام حیرت یہ ہے کہ ان سے پہلے کسی بھی دانشور کو ڈوگروں کی دھرتی کی دھڑکنیں قلمبند کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔یہ صاحبِ موصوف ہی کی ہمت اوران کا حوصلہ تھا کہ جمّوں کو ایک معتبر ومبسوط تاریخ دی اور ڈوگروں کو اپنا شاندار ماضی یاد دلایا بقول دلجیت ورما اسکالر

''یہ ایک کارِ عظیم تھا۔نرگس تیشۂ فرہاد لے کر اُٹھے اور کوہ بستیوں کے سینے میں شگاف کر کے جوئے شیر نکال لائے''۔

(نرسنگداس کی صحافتی زندگی۔ص:۱۵۔۱۶)۔

تاریخ نگاری کے ساتھ نرگس کو کس طرح رغبت ہوئی تھی اس کا خلاصہ انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

''جب رام کوٹ کے جاگیردار کے کام کے لئے دورہ کرنے جاتا تو راستے میں بے شمار آثارِ قدیمہ دیکھتا۔ پہاڑیوں پر غیر آباد قلعوں ،قدم قدم پر دہریوں ، باولیوں اور سُونے پڑے ہوئے مندروں اور کھنڈروں کی طرف نظر جاتی تو ٹھٹک کر رہ جاتا۔ کتنی کتنی دیر وہاں ٹھہر کر اس سوچ میں پڑا رہتا کہ ان سب میں اس دیس کا ماضی اور پراچین اتہاس پنہاں ہیں۔ آنے جانے والوں سے پوچھا لیکن جواب میں من گھڑت کہانیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اُن دنوں بھی میرے دِل میں خیال کبھی کبھار پیدا ہوتا تھا کہ اس سارے علاقہ کی تاریخ لکھنا چاہیئے جو کبھی اتنی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کی پارینہ عظمت کے نشان میرے سامنے ہیں ____ اور یہی تھا وہ مقام جس نے میرے دِل میں ایک خلش اور ایک انوکھی سی کرید پیدا کر دی کہ مجھے خود ماضی کے دُھندلے پردوں کو ہٹا کر سرزمینِ جمّوں کی اس پارینہ عظمت کو بے نقاب کرنا چاہیئے جس سے چشمِ عالم تو کیا، خود میرے ہم وطن بھی آگاہ نہیں''۔

(تاریخِ ڈوگرہ دیس۔ ہمارا ادب شخصیات نمبر۳۔ص:۲۴۳)

نرسنگداس نرگس کی شہرت کا آغاز اُن کی شاعری سے ہوا۔ جب ۱۹۴۷ء اخبار ''چاند'' اور ماہنامہ ''پریم'' شائع ہونے لگے تو وہ ایک صحافی ،افسانہ نگار اور ناول نویس کے طور پر بھی اچھی طرح متعارف ہو گئے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی والی ایمرجنسی حکومت نے اخبار ''چاند'' کو غیر معین عرصہ کے لئے بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ گو اس حکم میں اخبار پر بندش عائد کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی مگر بعد ازاں معلوم ہوا کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو چاند میں ''گاندھی کا ارشاد'' کے عنوان سے جو اداریہ شائع ہوا تھا، اسے حکومت نے قابلِ اعتراض قرار دیا تھا۔

بہرحال ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اس وقت کے وزیراعظم جمّوں وکشمیر شیخ محمد عبداللہ نے چاند پر لگائی گئی۔ جب پابندی اُٹھالی اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے دوبارہ روزنامہ ''چاند'' چھپنے لگا لیکن تین ماہ کے بعد اسے پھر ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار بنادیا گیا اور نرگس آخری وقت تک اس کے ساتھ منسلک رہے۔ نرگس کے لکھے ہوئے مضامین اور افسانے ''چاند'' اور ''پریم'' کے علاوہ ملک کے دوسرے اخبارات ورسائل میں آتے رہے اُن میں سے ''نیرنگِ خیال'' (ماہانہ رسالہ لاہور)، ادبی دُنیا (ماہنامہ رسالہ لاہور)، روزانہ اخبار ''ویر بھارت'' (لاہور)، روزانہ اخبار ''پرتاپ'' (لاہور) اور روزانہ رنبیر (جموں) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نرگس نے اخبار ''چاند'' کے ذریعے ریاست جمّوں وکشمیر کو جو شہرت بخشی ہے اُسے باشندگانِ ریاست کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کرسکتے۔ انھوں نے اپنی حیات کا نصف حصّہ اُردو صحافت کی خدمت گزاری میں بسر کیا۔ ''چاند'' اپنے دور کے صفِ اوّل کے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ نرگس کی ادارت میں جو مضامین شائع ہوتے تھے وہ بہت دلچسپ مدلّل اور فکرانگیز ہوتے تھے۔ شعری ونثری تخلیقات کے علاوہ سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تاریخی اور قومی موضوعات پر بھی مضامین ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں لکھی گئی عالمانہ کہانیوں ونظموں کے ترجمے اور ان پر دیدہ ورانہ تبصرے بھی چاند کی زینت بنتے تھے۔ چاند کی فائلوں کا مختصراً جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ نرگس نے اخبار کے معیار کو ہمیشہ بلند رکھا اور پکھش پات سے اوپر اُٹھ کر اور خوشامد چاپلوسی سے دور رہ کر انھوں نے ہمیشہ سچی اور کھری باتیں لکھیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو بلیک میل کرکے روپیہ نہیں بٹورہ اور ہمیشہ سچی اور وقتاً فوقتاً حکومت کو جھنجھوڑنے میں کبھی تامل نہیں کیا اور ہمیشہ حق وصداقت کا علم بلند رکھنے کے لئے دیگر صحیفہ نگاروں سے آگے رہ کر جموں وکشمیر کی تین اکائیوں (جموں، کشمیر اور لداخ) میں بسنے والے عوام کی

بہتری اور خوشحالی کے لئے مساویانہ عمل کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔

''نرگس صاحب صرف ایک اچھے صحافی اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ اپنے مضمون نگاروں اور قلمی معاونین کے ساتھ بڑی محبّت سے پیش آتے تھے اور وہ نہ صرف خود اچھے مضمون لکھتے بلکہ دوسروں سے لکھواتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ وہ یاروں کے یار اور دوستوں کے دوست تھے''۔

(دلجیت ورما۔ نرسنگداس نرگس کی صحافتی خدمات (غیر مطبوعہ) ص ۴۶۔۵۳۔

متذکرہ بالا حقائق کی بنیاد پر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنجہانی نرسنگداس نرگس ایک عظیم صحافی، افسانہ نگار، ناول نویس، شاعر، مورّخ اور ادیب تھے۔ انھوں نے صوبہ جمّوں میں اُردو زبان وادب اور صحافت کی جو ٹھوس خدمات سرانجام دی ہیں وہ رہتی دُنیا تک عزّت واحترام کی نگاہوں سے دیکھی جانے کی مستحق ہیں۔ موجودہ دور میں اس قسم کے ہُنر مند انسان ڈھونڈے بھی نہیں ملتے جبکہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ایسے ہی مخلص اور محنتی خدمتگاروں کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆

☆.....محمد نذیر فدا

ڈاکٹر رضیہ حامد.....اردو کی ایک ممتاز ادیبہ اور نقاد

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کے اُفق پر بہ مثل آفتاب بہت ساری شخصیات بڑی آب وتاب کے ساتھ چمک رہی ہیں ان میں سے ایک ڈاکٹر رضیہ حامد بھی ہیں جو کہ اردو زبان کی ایک ممتاز اور معروف نقاد اور تذکرہ نگار ہیں۔ تذکرہ نگاری ایک فن ہے اور اس فن میں وہ کمال رکھتی ہیں۔ میں نے اردو زبان میں لکھی تذکرہ نگاری کے کتب کا کم وبیش مطالعہ کیا ہے لیکن ڈاکٹر رضیہ حامد کا اسلوب اور انداز بیان نہایت ہی جامع ہے وہ شخصیت کو صحیح معنوں میں اجاگر کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں اور قاری نکتہ ہائے سخن کو بھرپور انداز میں سمجھنے میں کوئی دقّت محسوس نہیں کرتا۔ وہ شخصیت کو جاذب نظر بنانے میں بناوٹی پیوستہ کاری سے نہیں بلکہ صاف ستھرے الفاظ سے قاری کا دل موہ لیتی ہیں اور ایسا ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کے اسلوب سے پہلی بار مجھے محفوظ ہونے کا موقع اس وقت ملا جب والد مرحوم (مولانا محمد بشیر شوپیانی) نے مجھے ان کی کتاب ''نواب صدیق حسن خان'' غالباً سال 1984 پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس سے پہلے میں نے تفصیلی طور پر نواب صاحب کی زندگی اور نگارشات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مجھے مسرت ہوئی جب مجھے حال ہی میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی ایک اور مشہور کتاب ''نواب شاہجہاں بیگم'' موصول ہوئی۔ یہ کتاب بھی تذکرہ نگاری میں ایک لاثانی کتاب ہے۔ موصوفہ نے یہ

کتاب لکھ کر سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے البتہ نواب صاحب مرحوم کے معاصرین میں سے ایک مشہور عالم مولانا ابوالفتح عبدالرشید الشوبیانی الکشمیری کا ذکر کرنے سے رہ گیا ہے لگتا ہے کہ ان کو اس عالم و فاضل کے بارے میں اس وقت کوئی جانکاری نہیں ملی ہے اس وجہ سے راقم کو اپنی کتاب ''تذکرہ اسلاف'' میں اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے لکھنا پڑا۔ لیکن ان کے مدفن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا- صاحب **نزھة الخواطر** لکھتے ہیں کہ نواب صاحب سے بعد میں ان کے کچھ اختلاف ہو گئے اور ان کو ہوشنگ آباد جلاوطن کر دیا گیا اور بعد میں جبل پور میں ہی وفات ہو گئے۔ میں نے کئی عربی کتابوں میں ان کے لکھے ہوئے تقریظات پڑھے لیکن وہ قدر و منزلت میں آگے تھے کیوں کہ نواب شاہ جہاں بیگم کے بعد ہی ان کی تقریظ ہوا کرتی تھی۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ موصوفہ نے اس میں مولانا عبدالقیوم محدث بھوپالی کا تذکرہ مختصر انداز میں کیا ہے جو کسی تحفے سے کم نہیں لیکن پیاس بجھ نہ سکی کیوں کی بھوپال میں ان کی دینی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا اور یہ عالم و فاضل بھی بھوپال میں ہی مدفون ہے۔

زمرہ خواتین میں نقد و نظر کی نبض شناس ڈاکٹر رضیہ حامد کو بطور نمونہ پیش کرنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے ایک نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا ہے وہ بے جھجک اپنی ناقدانہ رائے ظاہر کرنے میں کتراتی نہیں بلکہ اس فن کو اجاگر یا اس میں کوتاہیوں کی نشاندہی کرنا اپنے فرض منصبی سمجھ کر ایک مقدس فریضے کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ان کا قلم مصلحت پسندی کے بجائے تیر و نشتر کا کام کرتا ہے جو گندے پس کو خون سے علیحدہ کرتا ہے اور دوسرے الفاظ میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ معتبر ناقدانہ رائے کی امین ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

ان کی ایک اور اہم تصنیف ''سرمایہ فکر ونظر'' ہے۔ واقعی یہ کتاب اسم با مسمی ہے اور اس میں فکر ونظر کے لا تعداد خزانے موجود ہیں۔ رضیہ صاحبہ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس میں اردو ادب کے ان شاعروں اور قلم کاروں کا تذکرہ ملتا ہے جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ واقعی خوب تر اور سنہرا نظر آتا ہے۔ رضیہ صاحبہ کی علی گڑھ تحریک سے محبانہ وابستگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر ہیں اور بجا طور ہم یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ اردو میں سرسید اور علی گڑھ تحریک ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس نے زبان و ادب دونوں کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ مجھے مسرت ہوئی کہ ان کے رشحات قلم میں مالک رام جیسے اردو کے مشہور قلم کار اور حواشی خواں کا تذکرہ ملتا ہے۔ حالانکہ منشی نول کشور کے بعد میں ان کے حواشی سے بہت متاثر ہوں۔ مالک رام واقعی علوم مشرقی کے ماہر تھے انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی بیشتر کتابوں کے حواشی رقم کیے جس سے عندیہ ملتا ہے کہ وہ اردو ادب کے بحر بے کراں تھے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نواب شاہ جہاں بیگم شیریں، نواب سلطان جہاں، بیگم، شہزادی عابدہ سلطان، بیگم حضرت محل، عطیہ خلیل عرب اور فیروزہ رعنا کا تذکرہ ملتا ہے اور اس طرح سے اردو ادب میں خواتین کا حصہ واضح طور بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح تذکرہ نگاری کے زمرے میں شامل ایک اور کتاب ''نواب سلطان جہان بیگم'' سال 2010 میں لکھی اور بعد میں باب العلم پبلی کیشنز کی وساطت سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک غیر معمولی اضافے سے کم نہیں۔ راقم نے ایک بار دوردرشن کے حالات حاضرہ پروگرام میں اس کتاب کا ذکر کیا۔

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ علی گڑھ یونیورسٹی کی

پہلی خاتون چانسلر رہی ہے اور انہوں نے بھوپال میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے اہم کام انجام دیا ہے۔ 1915 میں انہوں نے علی گڑھ میں پہلی بار گرلز اسکول کا افتتاح کیا جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ رعایا میں بالخصوص طبقۂ نسواں میں تعلیم عام کرنے کی متمنی تھیں۔ انہوں نے یہ کتاب نہایت ہی عرق ریزی اور محنت شائقہ کے ساتھ تیار کی جس میں تحقیق کا پہلو نمایاں ہے وہ واقعات اور حالات اس انداز کے ساتھ بیان کرنے میں ماہر ہیں جیسے سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

''متاع قلم'' بھی ان کی ایک مشہور تصنیف ہے جو انہوں نے سال 2016 میں طبع کی۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو زبان کے چند مقتدر ادیب اور شعرا کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے جس سے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب اور زبان دونوں پر دسترس رکھتی ہیں۔ اس کتاب کی یہ ایک خاص بات ہے کہ کتاب کے اہم گوشوں میں نواب سید صدیق حسن خاں اور سر سید احمد خان کی شخصیت کے ترکیبی عناصر کا مطالعہ کرنے کے بعد لگتا ہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد تذکرہ نگاری میں کوئی جواب نہیں رکھتی اور جب لکھتی ہے تو قاری تشفی پاتا ہے اور پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ انہوں نے آنند نرائن ملا، بشیر بدر، جاں نثار اختر، باسط بھوپالی اور ظفر نسیمی کے فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں رفعت سروش اور ملک زادہ منظور احمد کے شعر و سخن کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے جو اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

حال ہی میں ان کی ایک اور تصنیف ''فہم و ادراک'' سال 2020ء میں منظر عام پر آ گئی اس کتاب کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ رضیہ جی کا قلم ابھی تھکا نہیں بلکہ وہ نئے نئے عناوین کے ساتھ اردو ادب کی خوشہ چینی میں مگن ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں کہ ان کی ''فہم و ادراک'' کتاب اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف و شخصیات پر مبنی ہے اور

نئی نسل کے سچے خدمت گاروں کے کارہائے نمایاں واقف کرنا لازمی تھا کیوں کہ آج کل طلبا اپنے موضوعات کے علاوہ دیگر موضوعات کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔اس کتاب میں حمایت علی شاعر اور محمد احمد سبزواری کے علمی خدمات کو بھی بہترین طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اس کتاب کا ماحاصل وہ مضمون ہے جس میں فاضلہ مصنفہ نے سرسید، علی گڑھ اور بھوپال پر اپنے بھرپور خیالات کا اظہار کیا ہے کیوں کہ اردو ادب میں بھوپال کی خدمات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بلا تردّد کہی جا سکتی ہے کہ مدت تک یہ ریاست علم و ادب کا گہوارہ رہ چکی ہے۔ بھوپال کی سرزمین سے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شعرا کا تعلق رہا ہے جنہوں نے زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر و فن کو بھی اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور تاریخ میں ان کی خدمات کو سنہری الفاظ میں لکھا گیا ہے۔ محمد صادق ملا رموزی ایسی ایک بہترین مثال ہے جو رئیس بھوپال کے ایک چمکتے نگینے تھے مگر مجھے لگتا ہے کہ بڑی ناانصافی ہوئی ہے کہ اس میں مولانا ذوالفقار علی نقوی کا ذکر چھوٹ گیا ہے انہوں نے اس زمانے میں ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا اردو میں نہایت سلیس ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اس وقت بھی مسجد اہل حدیث گاوکدل سری نگر کی لائبریری میں موجود ہے۔

ان کی ایک اور کتاب "**قضاء الادب من ذکر علمائے النحو والادب**" کا بھی کہیں اتہ پتہ نہیں لیکن میں ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ وہ علمائے بھوپال کے بارے میں مزید تحقیق عمل میں لائیں تا کہ مجھ جیسے طالب علموں کی تشنہ طلبی ختم ہو جائے۔

ایک اور کتاب جو صفحہ قرطاس پر کب کی منظر عام پر آچکی ہے "آثار حرف" ہے جو سال 2018ء میں طبع ہوئی اور یہ تنقید پر لکھی ان کی بہترین کتاب

ہے۔اس کتاب کی افادیت اوراہمیت کے بارے میں اردو کے ایک مشہور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر رقم طراز ہیں۔

''تنقید کی پوری تاریخ میں جو خواتین نقاد و محقق اب تک اللہ کی عطا ہیں، ان میں ڈاکٹر رضیہ حامد زندہ جاوید رہیں گی۔ بلا شبہ ہندوستان اور پاکستان کے تنقید نگاروں میں ان کا اپنی کاوشوں سے پیدا کیا اپنا مقام ہے۔''

اسی طرح پروفیسر امیر عارفی لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کی خاص ادبی صحافت میں بحیثیت خاتون ڈاکٹر رضیہ حامد کو اوّلیت حاصل ہے وہ واحد خاتون ہیں جو نہ صرف صحافی بلکہ محقق اور نقاد بھی ہیں۔''

لیکن ایک مشہور ادیب جناب ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی نے صحیح طور اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ رضیہ حامد خاموشی سے ادبی کام کرنے والی خاتون ہیں۔صحافت کے ساتھ تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کی خدمات لائق ستائش ہیں۔''

ان کی اس کتاب کے بارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد فرماتے ہیں:

''رضیہ حامد آپ اردو زبان وادب کی جو خدمت کر رہی ہیں کل کا ادبی مورخ اسے فراموش نہیں کر سکے گا خدا کرے آپ کا یہ کام جو ایک مشن کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح جاری رہے بلکہ روز افزوں ترقی کرتا رہے۔ آمین۔''

اس کتاب میں خواتین کی صف میں ایک ادیبہ زہرا داؤدی بھی شامل ہیں جن کے بارے میں ملی جانکاری سے بہت خوش ہوں اس طرح کاروان خواتین میں ایک اور نام شامل ہوا جو رضیہ حامد کی محنت اور لگن کا پتہ دیتا ہے۔

میری نظر میں شاید ہی کوئی خاتون نقاد یا محقق برصغیر میں ایسا ہو جس نے اتنی تعداد میں کتابیں لکھیں ہوں یا جرائد کی ادارت میں شامل رہی ہو البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سیدہ محمدی صاحبہ برصغیر میں پہلی خاتون ایڈیٹر ہفتہ روزہ ''تہذیب النسواں'' کی رہ چکی ہے اور ان کے شریک حیات ممتاز علی ممتاز، علی گڑھ تحریک میں سرسید احمد خان کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے تھے میں نے رضیہ حامد صاحبہ کی کتابوں میں درج شدہ گوشہ خواتین میں ان کا نام نہیں پایا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ ایسا کیوں۔

ان کی ایک اور گراں قدر تصنیف ''کائنات فکر و نظر'' مشہور کتاب ہے۔

اس کتاب میں خواتین افسانہ نگار کے عنوان پر ایک معتبر مضمون ہے اور اس کمی کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ اردو میں خواتین افسانہ نگار کے کاروان کی نشان دہی کی جائے اور میں یہ بات فخر سے کہہ رہا ہوں کہ اس ضمن میں رضیہ صاحبہ کی محنت رنگ لائی ہے اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ یہ مضمون تالیف کرنے میں کامیاب ہوگئیں اس کا ایک اور مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہایت ہی شفاف طریقے سے تحقیق کر کے عنوان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ افسانہ نگاری کے صنف میں خواتین کا ایک عظیم حصہ ہے اور یہ مضمون رضیہ صاحبہ کے تبحر علم کا نتیجہ ہے کہ وہ اس عمدہ عنوان پر لکھنے کے لیے ذہنی طور تیار ہوگئیں۔

کتاب ''کائنات فکر و نظر'' میں کرشن چندر اور عصمت چغتائی کا ذکر آیا ہے یہ پڑھ کر میں جذباتی ہوا اور مجھے وہ لمحات یاد آئے جب ان دونوں افسانہ نگاروں سے میری ملاقات سری نگر میں ہوئی تھی اور آپس میں دیر تک باتیں کی تھیں۔ رضیہ سجاد ظہیر اور جیلانی بانو کا بھی اس کتاب میں خصوصی طور ذکر آیا ہے جو اردو افسانہ کے روح رواں ہیں۔

اس مختصر خاکے میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی ادبی خدمات پر مفصل طور تبصرہ کرنا ممکن

نہیں لیکن نا سپاسی ہوگی اگر ان کی دو کتابوں ''رفعت سروش۔شخصیت اور فن'' اور ''رفعت سروش بحیثیت نثر نگار'' کا ذکر نہ کیا جائے۔رفعت سروش کی شخصیت اور فن پر انہوں نے اردو زبان کے نامور قلم کاروں کے مضامین کو یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کتاب میں درج ہر ایک مضمون بجائے خود ایک کتاب ہے جن کو پڑھ کر رفعت سروش کی ادبی فن پاروں کا ایک اجمالی جائزہ نظر آتا ہے۔ رفعت سروش کے بارے میں اتنا جانتا تھا کہ وہ ریڈیو سے وابستہ تھے لیکن یہ دونوں کتابیں پڑھ کر اب اندازہ ہوا کہ وہ حقیقی تخلیق کار تھے جنہوں نے اردو ادب کی دنیا میں بہت نام کمایا وہ نثر نگاری میں بھی آگے ہیں۔وہ بہ یک وقت شاعر بھی ہیں،نقاد بھی،تاریخ نویس بھی،افسانہ نگار بھی اور انشا پرواز بھی۔لیکن رفعت سروش کی ان تمام خوبیوں کو اجاگر کرنے والی تو رضیہ حامد ہی ہیں جنہوں نے بازار ادب میں ان کے گراں قدر مال کو سجانے میں اپنا اہم رول ادا کیا۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کی مطبوعہ کتاب کی تعداد 28 ہے اور میں نے ان تمام کتب کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا ہے لہٰذا ان سب پر کچھ لکھنے سے قاصر ہوں اگر اللہ نے چاہا یہ دیگر کتب بھی مل جائیں تو کم از کم کچھ اور لکھنے کے لیے مواد مل جائے گا۔ان کی 6 اور کتابیں زیر ترتیب ہیں ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''۔وہ پچھلے 23 سال سے سہ ماہی فکر و آگہی دہلی کی مدیرہ ہیں اور سال 1986 سے لے کر سال 2020 تک انہوں نے تقریباً اس جریدے کے دس عدد خصوصی نمبر اجراء کیے۔وہ برصغیر کی ایک جانی مانی ادیبہ ہیں اور اب تک ان کو 18 عدد انعام و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی بے شمار تصنیفات دیکھ کر لگتا ہے کہ اس عظیم خاتون کی حق رسائی اس چھوٹے سے مضمون سے ادا نہیں ہو سکتی بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر ایک پوری کتاب لکھی جائے جس میں ان کے فکر و فن اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ

لیا جائے۔ وہ بحرالعلوم میں غوطہ زن ہیں اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کے طفیل سب پر سبقت حاصل کر چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ اردو کے فروغ میں پوری لگن سے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کا ذہن ادیبوں اور شاعروں کے فن پاروں کو اجاگر کرنے کا اہم کام انجام دینے میں ہمہ تن مصروف ہے جس سے اردو زبان کا خزانہ مالا مال ہو گیا ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کیوں کہ عربی زبان کا مقولہ ہے "**شهادات الاعمال قوی من شهادات الرجال**"، "یعنی کام کی شہادت لوگوں کی شہادت سے بھی قوی تر ہے ان کی بیسوں تالیف کردہ کتابیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ اپنے قلم کی جولانیوں سے تابندہ ہے اور ان کا ہر ایک لفظ آب دار موتی کے مانند ہے جو ایک سجی ہوئی دلہن کے جھمکے میں دور سے نظر آتا ہے۔

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی

اردو شاعری میں روزمرہ کا استعمال

شاعری ادب کا ایک حصہ ہے اور ادب فنونِ لطیفہ کا۔ فنونِ لطیفہ یعنی موسیقی، مصوری، شاعری، سنگ تراشی اور رقص۔ آج کل اس فہرست میں سنیما کو بھی شامل کئے جانے کی سفارشیں کی جارہی ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں شامل فنون کو دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ وہ فن ہیں، جن سے انسان کو ایک طرح کی انبساطی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چوں کہ ادب بھی انھیں فنون میں شامل ہے، اس لیے اس سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس سے بھی ہمیں حظ حاصل ہو بالخصوص شاعری سے تو عموماً یہی امید کی جاتی ہے۔ ادب کی مختصر اور آسان تعریف کم عیار کے نزدیک یہ کہ؛ تصور، تخیل، تفکر، مشاہدے اور تجربے کا شائستہ، عمدہ اور بہترین الفاظ میں اظہار ادب ہے۔

شعر، شاعر اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے اس بحث سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ لفظ 'شعر' کی قواعدی حیثیت اسم اور مطلب علم و دانش، واقفیت، کسی باریک چیز کو جاننا، اسی مناسبت سے 'شاعر' کی قواعدی حیثیت، صفت، علم یا واقفیت رکھنے والا ہے یعنی وہ جو کچھ کہتا ہے، اس سے پوری طرح سے واقفیت رکھتا ہے۔ مثلاً :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کس کی شوخیِ تحریر کا نقش فریادی ہے، جس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یہ بات غالبؔ کو بہ خوبی معلوم تھی، تبھی سوال کیا۔ کیوں کہ وہ سمجھنا چاہ رہے تھے کہ جب زندگی اتنی غیر یقینی شئے ہے، جس کی بساط کاغذ کی مانند ہے تو پھر اس میں اس قدر رنگا رنگی، دلچسپی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاعری کیا ہے؟ اس کی بحث بڑی طویل ہے کیوں کہ:

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار

شاعری الہامی شئے ہے یا اکتسابی، اس کے جملہ لوازمات کیا ہیں؟ عاجزا سے صرف نظر کرتے ہوئے روزمرہ پر آتا ہے۔

روزمرہ کو سمجھنے کے لیے ہیچ مداں نے مختلف لغات دیکھیں (فرہنگِ آصفیہ، فیروز اللغات، آن لائن اردو لغت، نور اللغت، مختصر اردو لغت، ریختہ لغت) اور جو کچھ سمجھ سکا وہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روزمرہ کا لفظی مطلب ہے ہر روز، ہمیشہ، متواتر، بلا ناغہ، روزانہ کی عام بات چیت لیکن کن کی؟ جب ہم اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اہلِ زبان کی گفتگو یعنی ''اہلِ زبان اپنی روز مرّہ کی بات چیت میں؛ جس طرح الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، اسے اصطلاحِ زبان میں روزمرّہ کہتے ہیں''۔ Language Lahore Centre for Engineering , نے اپنی آن لائن لغت میں روزمرہ کو حسب ذیل الفاظ میں درج کیا ہے۔

> ''ہر روز، آئے دن، ہر وقت، بول چال، روزانہ کی عام بات چیت کا اسلوب، جملے یا الفاظ کی ترتیب جو اہل زبان کے طریق استعمال کے مطابق ہو اور جس کے خلاف بولنا فصاحت کے خلاف ہو۔ مثلاً: پان

سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ بولا جائے تو روزمرّہ کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح بلا ناغہ کی جگہ بے ناغہ اور روز روز کی جگہ دن دن یا آئے دن کی جگہ آئے روز کہنا خلاف روزمرّہ ہے۔ کیوں کہ اہلِ زبان اس طرح نہیں بولتے''۔

نورالحسن نیّر نے ''نور اللغات'' میں روزمرہ کی تعریف ان الفاظ میں درج کی ہے۔

''روزمرہ ایک خاص قسم کی ترتیب الفاظ جو اہل زبان کی زبان پر ہو اور جس کے خلاف بولنا فصاحت کے خلاف ہو، اس میں الفاظ اپنے حقیقی معنی دیتے ہیں جو جملے کی ترتیب یا الفاظ کا طریقہء استعمال اردو زبان میں مقرر ہے، روزمرہ میں اس کی مطابقت لازمی ہے۔''۲

اب اگر ہم روزمرہ کی تعریف بیان کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا ایسا مجموعہ جو اہلِ زبان کی بول چال کے مطابق حقیقی معنوں میں استعمال ہو، اسے ہم روزمرہ کہیں گے۔ دراصل روزمرہ کی نزاکت کا معاملہ یہ ہے کہ بعض الفاظ قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتے ہیں مگر اہل زبان ان کو اس طرح استعمال نہیں کرتے تو وہ روزمرّہ کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے اہلِ زبان معمولی فرق کے لیے ''انیس بیس'' بولتے ہیں لیکن اسی کو ذہن نشین رکھ کر کوئی ۱۸، ۲۰ یا ۲۰۔۲۱ بولے تو اسے روزمرہ کے خلاف سمجھا جائے گا۔ اسی طرح میرے ساتھ ''تین پانچ'' مت کرو کو قیاس کر کے میرے ساتھ چار چھ یا آٹھ دس مت کرو بھی فصاحت کے خلاف سمجھے جائیں گے۔

وقت کس تیزی سے گزرا روزمرہ میں منیّر
آج کل ہوتا گیا اور دن ہوا ہوتے گئے

قواعد کے اعتبار سے کچھ سابقے منفی معنیٰ کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر : بےعزت، بےغیرت، نامعقول، ناسمجھ، غیرمرد اور غیرضروری میں 'بے'، 'نا' اور 'غیر' سبھی حروف نفی ہیں، ان کو کسی بھی لفظ کے پہلے یا سابقے کے طور پر لگا کر نفی کے معنی پیدا کئے جا سکتے ہیں مگر زبان داں، ان میں سے بعض حروف کو بعض الفاظ کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ قواعدی اعتبار سے ہم بےدرست، نادرست اور غیر درست، تینوں کو صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن اہلِ زبان بےدرست اور غیر درست نہیں بولتے ہیں، وہ صرف "نا درست" بولتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ نا درست فصیح ہے اور بےدرست، غیر درست، غیر فصیح۔ اسی طرح ''بے جانب دار'' یا ''ناجانب دار'' کا استعمال ہم نہیں کرتے کیوں کہ زبان داں غیر جانب دار کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ناحق اور بےحق کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے، دونوں ہی صحیح ہیں مگر اہل زبان ناحق بولتے ہیں۔ جیسے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا کہ روزمرہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے، تقریباً ایسی ہی تعریف محاورے کی بھی ہے۔ اس لئے پہلے روزمرہ کو مزید مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر محاورے کو سمجھیں گے۔ مثلاً: ساجد ''بلا ناغہ'' اسکول آتا ہے اور کلیم ''آئے دن'' اسکول سے فرار رہتا ہے۔ حامد اور ساجد میں ''انیس بیس'' کا فرق ہے۔ ان تینوں جملوں میں ''بلا ناغہ''، ''آئے دن'' اور ''انیس بیس'' درست روزمرہ کے مطابق ہیں۔ اگر ہم انھیں ''بے ناغہ''، ''آئے روز'' اور ''بیس بائیس'' کا فرق کہیں گے تو یہ روزمرہ کے خلاف ہوں گے۔ حالانکہ قواعدی طور سے کوئی غلطی نہیں ہوگی۔

ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ روزمرّہ میں فصاحت کی جان بستی ہے اور فصاحت

شاعری کی جان تسلیم کی جاتی ہے۔شاید ایسے ہی موقعے کے لیے میر انیسؔ نے کہا ہے کہ:

روز مرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی
لب ولہجہ وہی سارا ہو ،فصاحت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

ہم میں سے اکثر کو روزمرّہ اور محاورے کی تفریق میں شش و پنج ہوتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ محاورہ بھی اہل زبان ہی کے مخصوص استعمال کا نام ہے مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ محاورے میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں سے تجاوز کر جاتے ہیں یعنی مجازی یا قیاسی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: "نو دو گیارہ ہونا" کے معنی غائب ہونے اور بھاگ جانے کے ہیں۔ حالانکہ اگر نو جمع دو کریں تو واقعی گیارہ ہی ہوں گے۔اسی طرح ''ناک کٹانا'' اور ''سر کھانا'' محاوروں کا مطلب واقعی میں ناک کٹانے اور سر کے کھانے سے ہرگز نہیں ہے۔ناک کٹانا محاورے کا مطلب بدنام، رسوا اور دشنام ہونے سے ہے اور سر کھانے کا مطلب، بک بک کرنا یا پریشان کرنا ہے۔

جب کہ رنگیں کے یہاں آنے کی سنتی ہے خبر
اپنا سر بک بک کے کھا جاتی ہے اردا بیگنی
(رنگینؔ)

بینیِ یار سے دعویٰ ہے گلِ زنبق کو
بے حیائی سے مگر ناک نہیں کٹتی ہے
(آتشؔ)

روزمرہ، محاورہ ہی سے ملتی جلتی چیز کہاوت بھی ہے۔ سرِ دست اسے بھی سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ اس کا مطلب کہیں سے بھی کفر کے ٹوٹنے سے نہیں بلکہ کسی کام کے بڑی بھاگ دوڑ اور مشکلوں سے انجام پانے سے ہے۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اسی طرح چور چور موسیرے بھائی کا مطلب دو ہم پیشہ لوگوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ہونے سے ہے۔ جیسے برطانیہ امریکہ تعلقات چور چور موسیرے بھائی کے مصداق ہے۔

اب تک ہم نے جتنی مثالیں یہاں پیش کیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روزمرّہ میں الفاظ کا حقیقی معنی سے تعلق برقرار رہتا ہے مگر محاورے میں نہیں اور کہاوتیں سماج کی عملی زندگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ روزمرہ میں کبھی کبھی قواعد کی خلاف ورزی بھی ممکن ہے مگر لغوی معنی کا تعلق برقرار رہتا ہے۔

اردو میں مذکر اور مونث دونوں کے ضمیر مشترک ہیں مگر فعل میں تذکیر و تانیث کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے لیے قواعدی اعتبار سے جمع متکلم مونث کے افعال بھی مونث ہونے چاہئیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ "ہم جاتی ہیں" قواعدی نظر سے بالکل صحیح ہے مگر اہل زبان مونث کے لیے بھی فعل مذکر لاتے ہیں اور جمع متکلم مونث کی صورت میں "ہم جاتے ہیں" بولتے ہیں یعنی جمع متکلم مونث اور مذکر میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ کیوں کہ ضمیر کی کوئی جنس نہیں ہوتی ہے۔ یہی اہل زبان کا طریقہ ہے، اس لیے اسی طرح بولنا درست ہے۔ "ہم جاتی ہیں" صحیح تو ہے مگر خلاف روزمرّہ ہونے کے باعث غیر فصیح ہے۔

مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ روزمرہ میں الفاظ کے لغوی معنی برقرار رہتے ہیں مگر کبھی کبھار قواعد کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس محاورہ میں الفاظ کے مجازی

معنی لئے جاتے ہیں مگر عموماً قواعد کی پابندی کی جاتی ہے مثلاً، وہ آئے دن اسکول سے رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اس جملے میں ''آئے دن'' درست روزمرہ ہے لیکن اگر اسے ''آئے روز'' لکھا جائے، تو یہ اہلِ زبان کی بول چال کے خلاف ہوگا۔ اس لئے نادرست مانا جائے گا۔ اب ایک اور مثال لیتے ہیں۔ ''روز بروز'' مہنگائی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس جملے میں ''روز بروز'' درست روزمرہ ہے۔ کیوں کہ اہلِ زبان ''دن بہ دن'' نہیں بولتے۔ اب یہ بات واضح ہوئی کہ ''روز اور دن'' ہر چند کہ ہم معنی ہیں لیکن ''آئے'' کے ساتھ ''روز'' کا استعمال درست نہیں کیوں کہ اہلِ زبان ''آئے دن'' بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''روز بروز'' کی جگہ ''دن بہ دن'' غیر فصیح ہے۔ شاید شبلی نے موازنہء انیس و دبیر میں ایسے ہی نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

شبنم کی جگہ اوس یا اوس کی جگہ شبنم لانے سے فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ اسی طرح آئے دن کی جگہ آئے روز اور نادرست کی جگہ ناصحیح، یا بلا ناغہ کی جگہ بے ناغہ استعمال کریں گے تو قواعد کے اعتبار سے غلطی نہیں ہوگی تب بھی معاملہ فصاحت سے خارج ہو جائے گا۔ اسی لیے میر انیس نے کہا ہے کہ:

آئے سجادہ ء طاعت پہ امامِ دو جہاں
اُس طرف طبل بجا، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کی زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں

زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

یا ایک دوسرے مرثیے کا ایک بند ہے:

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں

میر انیسؔ کے یہاں لفظ کا ایسا برمحل استعمال ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ زبان کی نزاکت، الفاظ کے در و بست اور ان کا برمحل استعمال، شعر کے قالب میں اس طرح ڈھلتے ہیں کہ قاری یا سامع عش عش کر اٹھتا ہے۔ مذکورہ پہلے بند میں زاہد اور عابد ایسے ہی الفاظ ہیں، جن کو ہم نیکوکار سمجھتے ہیں لیکن انیسؔ نے جس طرح ان کے امتیاز کو برتا ہے، اس سے دونوں میں فرق بالکل ظاہر ہو گیا ہے۔ دوسرے بند کا معاملہ اپنی زبان دانی، موزونیِ طبع اور لفظی ذخیرے کے ساتھ ساتھ، خیالات، تصورات اور تفکرات پر قدرت کا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو ایسا کر سکتا ہوں۔ یہ تعلّی کا بند ہے لیکن اس میں میر انیسؔ کی قوت شاعری اور لفظ پر قدرت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ میر انیسؔ کا معاملہ یہ تھا کہ:

دست بستہ ہیں مضامین کہ ہم حاضر ہیں
قافیے پاؤں پکڑتے ہیں کہ باندھو ہم کو

میر انیسؔ کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے، ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان

کے یہاں لفظوں کی بارش ہوتی تھی تھی۔ان کے یہاں الفاظ جس سلیقے سے برتے گئے ہیں، وہ اہلِ نظر ہی سمجھتے ہیں۔اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں جب روزمرہ کا استعمال کاملیت کے ساتھ ہوتا ہے تو سامعین یا قاری پر اس کا راست اور گہرا اثر ہوتا ہے۔جیسے:

سمجھ میں صاف آ جائے فصاحت اس کو کہتے ہیں
اثر ہو سننے والے پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ شاعری میں جب لفظ ایک تواتر اور عام بول کی ایک خوش آہنگی کے ساتھ آتے ہیں تو اس کی اثر آفرینی، کیفیت اور 'اِدھر منہ سے نکلی؛ اُدھر دل میں اتری' والا معالہ ہوجاتا ہے۔مثلاً:

سوچا نہیں، اچھا برا، دیکھا سنا، کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے، رات دن تیرے سوا، کچھ بھی نہیں
سوچا تجھے ،چاہا تجھے، مانگا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا ،میری جفا، تیری خطا، کچھ بھی نہیں
جس پر ہماری آنکھ نے موتی بچھائے رات بھر
بھیجا اسے، کاغذ وہی، اس پر لکھا کچھ بھی نہیں

روزمرہ کا استعمال شاعری میں آراستگی کا کام کرتا ہے۔اس لئے شعر میں جو لفظ آئیں، ان میں ایک خاص طرح کی ترتیب، تسلسل اور تناسب ہو تو وحدتِ تاثر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔جیسے:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے ''دن رات'' کے شکوے
کفن سرکاؤ میری ''بے زبانی'' دیکھتے جاؤ
(فانی)

وہ عکس بن کے مری ''چشمِ تر'' میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
(بسمل صابری)

ان اشعار میں 'رات دن'، 'بے زبانی' اور 'چشمِ تر' کا استعمال توجہ کا طالب ہے۔ 'رات دن' کو 'شب و روز'، 'بے زبانی' کو 'ناز بانی' اور 'چشمِ تر' میں چشم کی جگہ آنکھ کا لفظ استعمال کرنے سے روز مرہ کے ساتھ فصاحت بھی ہوا ہو جائے گی۔ جب کہ قواعد کی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ حالانکہ چشم اور آنکھ دونوں ہم معنیٰ استعمال کئے جاتے ہیں پھر بھی 'آنکھ تر' کا استعمال دیکھنے کو نہیں ملتا۔ لفظ اور اس کے در و بست کے سلسلے میں میر انیسؔ کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گُل رُو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامِ دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامِ دارد

یہ بند ''نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' کا ہے۔ اس بند میں شاعر نے یہ دعا مانگی ہے کہ اے خدا! مجھے شاعری میں ایسی ہی گویائی بخش دے کہ جہاں جیسے مناظر، مناسبات، خیالات، تصورات اور الفاظ کی ضرورت ہو، میں ٹھیک وہی اور ویسا ہی استعمال کروں۔ جیسا کہ ٹیڑھا پن ابرو کے علاوہ ہر جگہ عیب معلوم ہوتا ہے مگر جب بھنوؤں میں ہوتا ہے تو حسن میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ تیرگی یعنی اندھیرا یا کالا پن جہاں کہیں بھی ہو، اسے اچھا تسلیم نہیں کیا جاتا مگر جب یہی کالا پن زلفوں میں ہوتا ہے

تو اُف توبہ! کا معاملہ ٹھہرتا ہے۔ سُرمہ اگر کپڑے میں یا کہیں اور لگ جائے تو داغ کا سبب بنتا ہے لیکن جب آنکھوں میں لگتا ہے تو ان میں مزید کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پھول جیسے چہرے پر جب کالا تل ہوتا ہے تو تِل چہرے کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ یہ مثالیں ایسے ہی میر انیسؔ نے نہیں دی ہیں بلکہ اپنی شاعری میں لفظوں کے استعمال کے لئے مانگی ہیں کہ ایسا ہی اثر میری شاعری میں دے دے کہ جہاں جیسے موقعے پر جس لفظ کی ضرورت ہو، مجھے ویسی ہی شاعری کی توفیق عطا کر دے تا کہ میرے کلام میں فصاحت کمال کو پہنچ جائے۔

اردو شاعری میں روزمرہ کے استعمال کے لئے ہمیں اپنے کلاسیکی متون کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ وہ روزمرہ ہمارے مزاج کا حصہ بن جائے جو اہلِ زبان کا خاصہ ہے۔

لسانیات کے اصول ہمیں بتاتے ہیں کہ جب زبان اپنے مرکز سے دور جاتی ہے تو جہاں پہنچتی ہے، وہاں کے روزمرہ، بول چال، رکھ رکھاؤ، تہذیب اور لوازمات بھی اس میں در آتے ہیں۔ مثال کے لئے دکن اور وادیِ بے نظیر، کشمیر کا علاقہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کسی بھی زبان کے لئے منفی نہیں بلکہ مثبت عمل ہوتا ہے۔ اس سے زبان کے لفظی ذخیرے، اس میں اظہار کی قوت اور گوناگوں چیزوں کو پیش کرنے کی نمو پروان چڑھتی ہے مگر یہ بدلاؤ روزمرہ اور تخلیقی زبان میں نظر آتا ہے، تنقیدی زبان میں نہیں۔ ہمیں بھی اس میدان میں مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ http://oud.cle.org.pk/

۲۔ نورالغات، جلداول، مولوی نورالحسن نیر کاکوروی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، 1989، ص: ۵

کتابیات:

۱۔ خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ 2016

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، لغاتِ روزمرہ، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، نئی دہلی۔۱۱۰۲

۳۔ مولوی نورالحسن نیر کاکوروی، نورالغات، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، 1989

۴۔ مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2003

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر ریاض توحیدی

دیپک بدکی کی افسانہ نگاری

(نصف صدی کا قصہ)

کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک بُدکی، علمی وادبی خدمات کی وجہ سے اردو فکشن میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں۔آج تک ان کی تحقیقی وتنقیدی اور تخلیقی نوعیت کی تقریباً پچیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔جن میں تحقیقی نوعیت کی تصنیف 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' بڑی اہم نظر آتی ہے' کیونکہ اس میں غیر مسلم اردو افسانہ نگاروں کی حیات وخدمات پر جامع انداز سے احاطہ کیا گیا ہے۔باقی تصانیف بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔افسانوی ادب کے ضمن میں ان کے دس (۱۰) مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جو حسب ترتیب اس طرح سے ہے: ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، جڑوں کی تلاش، مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ، پتوں پر لکھی تحریریں۔

ان کے کئی افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، بنگالی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی زبان میں ترجمہ ہوچکے ہیں اور چند رسائل نے ان پر خصوصی گوشے/نمبر بھی نکالے ہیں۔جن میں شاعر (ممبئی)، انتساب عالمی (سرونج)، اسباق (پونے)، عالمی میراث (پونے) شامل ہیں۔علاوہ ازیں ان کی شخصیت اور فن پر پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر نے ایک اہم کتاب 'ورق ورق آئینہ...دیپک بدکی۔

شخصیت اور فن' مرتب کی ہے اور جاوید اقبال شاہ کی ایک کتاب 'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری بھی' شائع ہو کر آئی ہے۔ اعزازات سے بھی نوازے گئے ہیں۔

دیپک بدکی صاحب کے ادبی کام کا آغاز 1970ء سے ہوا ہے، بعد میں چند برسوں تک اگرچہ اس میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا تاہم اس کے بعد یہ سلسلہ عصر حال تک جاری ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا دورانیہ قریباً نصف صدی کے عرصے تک محیط ہے۔ اس طرح سے دیپک بدکی کے افسانے نصف صدی کا قصہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس دوران زندگی نے کتنے رنگ بدلے، کتنے سماجی و ثقافتی اور ماحولیاتی واقعات وحادثات پیش آئے۔ ان کے افسانوں میں ان سب تغیرات کی تخلیقی عکاسی کسی نہ کسی پہلو سے نظر آتی ہے، جو کہ ان کی افسانہ نگاری کی ایک اہم خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

چونکہ دیپک بدکی کی افسانہ نگاری کا آغاز ستر کی دہائی میں ہوا تھا اور اس دور کے افسانوں میں بٹوارے اور سیاسی وادبی تحریکوں اور جدیدیت کے اثرات نمایاں ہوتے تھے تو دیپک بدکی کے کئی افسانوں میں یہ اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ جیسے افسانہ 'جاگو'، 'ادھورے چہرے'، اور 'خودکشی' وغیرہ۔ کئی افسانوں میں رومانوی کہانیاں بھی موجود ہیں جو کہ شباب کا خاصہ ہوتا ہے۔ فنی، موضوعاتی اور اسلوب کی سطح پر ایک افسانے 'جاگو' پر توجہ دیں تو موضوعاتی طور پر یہ افسانہ 'ایمرجنسی' کی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے اور فن اور اسلوب کے لحاظ سے یہ تجریدی اسلوب کا حامل ہے اور علامتی سطح پر اشاروں کنایوں اور کردار نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دور ایسا تھا کہ کوئی بھی انسان حقیقت کا اظہار سیدھے طور پر نہیں کرسکتا تھا۔ افسانے میں کردار نگاری خود راوی نبھا رہا ہے اور اُس وقت کے ملک کی حالت دیکھ کر راوی تخلیق قصہ آدم کے مقصد، انسان کی حیوانیت اور تاریخ کے جابر کرداروں کی جبریت وغیرہ کو جذبات انگیز انداز سے اشاروں کنایوں میں کہانی کا حصہ بنا رہا ہے۔ افسانہ اپنے مقصد کی ترسیل

میں کامیاب نظر آتا ہے تاہم حد سے زیادہ تجریدی اسلوب بیشتر قارئین کے لئے پورا ماجرا سمجھنے میں اڑچن بھی پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد جو افسانے تخلیق ہوئے ہیں ان میں افسانے کے موضوعات میں تبدیلی آتی گئی اور افسانہ نگار بھی نئے موضوعات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتا چلا گیا۔ افسانہ 'پھٹا ہوا البم' زندگی کے بیتے لمحوں کی کہانی پیش کر رہا ہے۔ اس کا راوی مرکزی کردار کی حیثیت سے ساری کہانی بیان کرتا ہے تاہم کہانی کو پیش کرنے میں اس کی بہو، سوشیلا اور پوتی، شار کا اہم کردار ادا کر رہے ہیں کیونکہ ان کی موجودگی ہی سے کہانی کے مختلف موڑ سامنے آتے ہیں۔ افسانے میں کئی قصے بیان ہوئے ہیں۔ گھر سے کتابوں کے اخراج کا دکھ، رومانس کا قصہ، شادی اور راوی کے وجودی کرب کا اظہار۔

کسی بھی افسانے میں کوئی واقعہ یا کہانی بیان کرنے کا تخلیقی اسلوب موثر ثابت ہوتا ہے نہیں تو یہ ایک طرح سے روداد نما قصہ ہی بن سکتا ہے اور فنی اعتبار سے کوئی قابل توجہ تخلیق سامنے نہیں آسکتی ہے۔ تخلیقی اسلوب میں مشاہدے کے ساتھ ساتھ تخیل کی کارگزاری بھی اہم ہوتی ہے۔ افسانہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' تخلیقی سطح پر مشاہدے اور تخیل کا عمدہ نمونہ ہے۔ افسانے کا کردار ایک طرح سے علامتی نوعیت کا ہے جو ایک عمر رسیدہ مہاجر پنڈت کی صورت میں موجود ہے۔ افسانے کا عنوان بھی علامتی اساس کا حامل ہے یعنی 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'۔ یہ زیبرا کراسنگ اور اس پر کھڑا آدمی کون ہوتا ہے جس پر پورا افسانہ تخلیق ہوا ہے؟ یہ دراصل کشمیر کے ان مہاجر پنڈتوں کی دلدوز کہانی ہے جو کسی بھی وجہ سے کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو کر جموں کے مائیگرنٹ کیمپوں یا دوسری جگہوں پر زندگی کی تلخیاں جھیلنے پر مجبور ہو گئے۔ مشاہداتی طور پر کہانی کا کینڈا مقامی موضوع سے تیار کیا گیا ہے اور فنی طور پر تخیل کی آمیزش سے ایک دردناک کہانی سامنے لائی گئی ہے۔

ذاتی طور پر مجھے یہ افسانہ فنی اور تخلیقی طور پر پسند آیا۔ کیونکہ اس میں حقائق کو مبالغہ آمیز بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے وہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے جو ایک افسانہ تقاضا کرتا ہے۔ افسانہ 'ایک اور ہجرت' دلچسپ کہانی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں ایک کشمیری پنڈت کی کہانی بیان ہوئی ہے جو دوسرے مہاجر پنڈتوں کے برعکس کشمیر میں ہی رہتا ہے اور راوی کے پوچھنے پر وہ اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مسلم برادری کے اچھے سلوک کی بھی تعریفیں کرتا ہے۔ اگرچہ بعد میں وہ اپنی فیملی کو جموں بھیج دیتا ہے لیکن وہ کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے نہیں۔

گزشتہ سال دیپک بدکی کا ایک نیا افسانوی مجموعہ 'پتوں پر لکھی تحریریں' شائع ہوا ہے۔ اس میں چند ایسے افسانے بھی شامل ہیں جو کرونائی فکشن کے زمرے میں آتے ہیں اور دوسرے افسانے مختلف موضوعات پر تخلیق ہوئے ہیں۔ افسانہ 'کالے حروف کا ساحر' ایک تخلیق کار کی عمدہ کہانی پیش کرتا ہے جبکہ افسانہ 'خودسر صحافی' ایک خوددار اور جرأت مند صحافی کی سوچ اور صحافتی ذمہ داری کی فکرانگیز کہانی سامنے لا رہا ہے۔ کووڈ-۱۹ یا کرونا وائرس کے ایام میں متاثرہ لوگوں خصوصاً عمر رسیدہ افراد کو کن کن نفسیاتی الجھنوں اور جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا، اس کی عکاسی چند افسانوں میں دردانگیز اسلوب میں کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو دیپک بدکی کی افسانہ نگاری کئی دہائیوں کے موضوعات اور کہانیوں سے قاری کو محظوظ کرتی ہے۔ ان کے کئی افسانے فنی و فکری اور موضوعاتی سطح پر بڑے معیاری ہیں، جن میں 'جاگو'، 'ادھورے چہرے'، 'خودکشی'، 'کینچلی'، 'بٹی ہوئی عورت'، 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'پھٹا ہوا البم'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' وغیرہ شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے اس قسم کے کچھ اور بھی معیاری افسانے ہوں گے لیکن ان تک میری رسائی نہیں ہوسکی۔ علاوہ ازیں چند افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ان میں

ابتدایا درمیان میں افسانہ نگار موضوعاتی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے کہ پلاٹ ایک وضاحتی بیان بن جاتا ہے جس سے افسانے کا وحدت تاثر زائل ہوجاتا ہے اور ایک خوبصورت افسانہ روداد کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ان میں اگر کہانی کے تھیم کو ہی 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کی طرح آگے بڑھایا جاتا تو فن اور کرافٹ سے افسانہ نکھر جاتا۔

☆☆☆

☆.....ارشاد آفاقی

ایازؔ رسول نازکی کی غزلیہ شاعری

عروسِ شعروسخن سے ایازؔ رسول نازکی کی شناسائی کوئی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق کشمیر کے ایک ایسے خانوادے سے رہا ہے جسے شاعری وراثت میں ملی۔ ایاز رسول نازکی کے والد بزرگوار (میر غلام رسول نازکی) قادرالکلام شاعر اور نامور استادِ سخن تھے۔ اس گلستان میں ایاز رسول نازکی پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور سائنس پڑھنے کے باوجود شعروشاعری سے دامن بچا نہ سکے۔ دراصل بچپن ہی سے ان کے گوش شعروشاعری کی میٹھی صداؤں سے مانوس ہوگئے اور ان کے دل ودماغ رس بھری صدائیں سننے کے عادی بن چکے تھے۔ جب ان کے گھر پر مستند اور معتبر شعراء کی محفلیں جمتی تھیں۔ شعر سنتے تھے اور سناتے بھی تھے۔ واہ واہ کی صدائیں گونجتی تھی اور مکرر وارشاد کی آوازیں آتی تھیں۔ اس ماحول میں رہ کر ایاز رسول نازکی کے لیے فنِ شاعری کے جملہ لوازمات سے بھرپور آگہی حاصل کرنا، اردو زبان کے اسرار ورموز سے واقف ہونا، زبان وبیان پر دسترس حاصل کرنا آسان ہوگیا اور جستہ جستہ شعروادب سے آپ کا شغف نہ صرف بدستور جاری رہا بلکہ روز بروز بڑھتا رہا۔ طبع آزمائی ہوتی رہی، شعر کا ورد ہوتا رہا۔ شعری مجموعے وجود میں آتے رہے اور قارئین وناقدین داد دیتے رہے۔ جس کا اندازہ آپ کو بخوبی ہے۔

جانتے ہیں ہم کہ کہتے ہو بہت ہی کم ایازؔ
جو غزل تم نے کہی اس کی تعریفیں ہوئیں

لکھی ہے ایسی غزل جو آیازؔ برسوں میں
سنیں جو داغؔ کہیں گے کمال ہم نے کیا

ایاز رسول نازکی کو گھر کے ماحول نے فطری شاعر بنا دیا ہے۔اس لیے ان کی طبیعت شروع ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تھی اور چھپ چھپ کے شعر موزوں کرتے رہے۔مگر ان کی شناخت ۱۹۹۰ء کے بعد ہی طے ہونا شروع ہوئی۔جب ان کی ایک غزل ملک کے مقتدر ماہنامہ ''شب خون'' ۱۹۹۲ء میں چھپی ہے،جس کے چند اشعار ملاحظ ہوں۔

میں سپید ے کا پیڑ ہوں لیکن
برف نے میری ٹہنیاں توڑیں
اس کے پردے ہوا ہلا پاتی
میرے کمرے کی کھڑکیاں توڑیں
میرے بچپن میں ایک بوڑھا تھا
اس کے بیٹوں نے لکڑیاں توڑیں

اشاعتِ کلام سے ایاز رسول نازکی کی ہمت افزائی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ادبی حلقوں میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔اس طرح شعروشاعری کے تئیں شوق بڑھتا گیا طبیعت کا رجحان غزل کی طرف ہے حالانکہ نظمیں اور قطعات بھی کہے۔اس لیے میں انھیں غزل کا شاعر سمجھتا ہوں ۔ان کے اب تک تین شعری مجموعے ''خودرو'' (اردو) ۲۰۰۱ء، ''مقامِ راست'' (کشمیری) ۲۰۰۴ء اور ''شام سے پہلے'' (اردو) ۲۰۰۸ء منظر عام پر آئے ہیں۔ نیز ان کی شاعری کا ایک انتخاب ''قدرِ ایاز'' ۲۰۱۷ء کے نام سے شائع ہوا ہے۔برسبیل تذکرہ ''قدرِ ایاز'' ان کے شائع شدہ کلام کا ایک ایسا عمدہ انتخاب ہے جس کے پڑھنے کے بعد ''خودرو'' اور ''شام سے پہلے'' پڑھنے کی الگ الگ ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

شاعری میں داخلی و خارجی خیالات و جذبات، مشاہدات و تجربات کی وسیع ترین آزادی اظہار ہے۔ اس کے باوجود بعض شعرا نے گنجلک و مشکل الفاظ سے اپنے کلام کو پیچیدہ اور بے کیف بنا دیا ہے اور بعض نے آسان اور سادہ الفاظ کا انتخاب کر کے اپنے کلام کو مترنم اور پُر کیف بنا دیا ہے۔ جن شعراء نے مواخرالذکر رنگ اور انداز اپنا لیا ہے ان میں ایاز رسول نازکی شامل ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری سہل ممتنع کی اچھی مثال ہے۔ ان کی سہل بیانی اتنا متاثر کرتی ہے کہ ان کے کلام سے سرسری طور پر گزرنا یا بہ عجلت پڑھ کر ختم کرنا کسی صورت گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کو جستہ جستہ پڑھنے میں خوب لطف آتا ہے اور قاری کو لگتا ہے کہ وہ جو شاعری پڑھ رہا ہے اس میں لفظوں سے کھلواڑ نہیں بلکہ ان تجربات و مشاہدات کا راست اظہار ہے جو شاعر کے عمیق ادراک پر مبنی ہیں جس میں رنگ فصاحت بھی ہے اور حسن بلاغت بھی۔ اس حوالے سے محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:

> ''مجھے ایاز رسول نازکی کی سہل بیانی نے بہت متاثر کیا ہے۔ اردو ہمارے یہاں اپنی بقا کے لئے جو جنگ لڑ رہی ہے اس میں اس کے لب و لہجے اور رمز و کنایہ کی عوام پسندی اس کا بہت بڑا سامان حرب ہوگی۔ کیونکہ اب یہاں کسی کو فرہنگ کی تصدیق اور اردو کی بڑی روایت سے توثیق کرنے کی نہ رغبت ہے اور نہ فرصت۔ اس حال میں ایاز رسول نازکی کا صاف و شفاف اسلوب دل کو لبھاتا ہے لیکن اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لہجے کی عوام نوازی کے باوجود احساس اور تصور کی خواص پسندی کو قربان نہیں کیا ہے۔ ان کے اچھے اشعار کو پڑھ کر اردو کے اچھے اور کئی صورتوں میں بڑے شاعروں کی آوازیں ذہن میں گونج پیدا کرتی ہیں۔ لیکن وہ عامیانہ پن اور فلمی ابتذال سے دامن بچا لیتی ہیں۔ میں اسے

شاعر کی حسیت کی پاک دامنی کے برابر سمجھتا ہوں۔اردو کے تمام سخن
سرایوں کے لئے اس روایت کی پاسداری ممکن نہیں ہوسکی ہے۔''

(''گملے میں چنار''ازمحمد یوسف ٹینگ مشمولہ''شام سے پہلے''(۲۰۰۸)

غزل اردو شاعری کے ہر دبستان میں مقبول عام اور ہر شاعر کی محبوب ترین صنف رہی ہے۔ایاز رسول نازکی کو یہ صنف نہ صرف محبوب ہے بلکہ وہ بنیادی طور اسی صنف کے شاعر ہیں۔انھوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔حسن وعشق ،ہجر ووصال ،انتظار وشکایات،طلب وجستجو جیسے روایتی موضوعات پر ایاز رسول نازکی نے بھی طبع آزمائی کر کے اپنے مخصوص رنگ وڈھنگ میں کئی رنگارنگ غزلیں کہی ہیں۔

دل کا قصہ وہی پرانا ہے
پھر نئے ڈھنگ سے سنانا ہے

ان کے علاوہ ان کی غزلوں میں اپنے گرد وپیش کے حالات وواقعات کی بہترین عکاسی بھی ملتی ہے۔انھوں نے ان حالات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی ہیں۔انہوں نے نشیب وفراز اور اتار چڑھاؤ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس نے زندگی اور سماج میں جو سنگین صورت حال پیدا کی ہے اس سے وہ متاثر ہوئے۔چنانچہ اس تاثر کے مختلف اور متنوع روپ ان کی غزلوں میں موجود ہیں۔غرض ان کی غزلیں عصری آگہی اور عصری حسیت کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں روح عصر اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ان کے درج ذیل اشعار اس زمانے اور زندگی کے صحیح اور سچے مرقع معلوم ہوتے ہیں۔

گونگی بہری بستیوں میں لوگ رہتے ہیں ایازؔ
کوئی کہتا بھی نہیں کوئی سن پاتا نہیں

☆

اس نگر کے لوگ سارے سر برہنہ ہو گئے
ان کے قدموں میں پڑی اب اُن کی ہی دستار ہے

☆

نکلا جو صبح کو تو شگفتہ گلاب سا
لوٹا جو شام کو تو وہ زخموں سے چُور تھا

ایاز رسول نازکی کی غزلوں کا ایک اہم موضوع کشمیر، اس کی خوبصورتی، اس کے لہلہاتے قدرتی نظارے، اس کے آبشار، اس کے چشمے اور اس کے صحت افزا مقامات کے علاوہ یہاں کے ناسازگار حالات وواقعات بھی ہیں کیونکہ شاعری شاعر کے تاثرات اور سماج کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے ایاز رسول نازکی بھی ہنگامی کیفیتوں اور بے سروسامانیوں سے دامن بچا نہ سکے بلکہ ان کی غزلیہ شاعری میں قدم قدم پر ایسے موضوعات ملتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ہجرت کا موضوع بھی ان کی شاعری میں اپنا اثر دکھا چکا ہے۔ کیونکہ کشمیر سے بہت سارے لوگ ہجرت کر گئے جس کا اثر ہر فرد نے محسوس کیا ہے مگر حساس ہونے کے ناطے فنکار کا دل کچھ زیادہ ہی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کے طرح طرح کے پہلوؤں پر لب کشائی کرتا رہتا ہے۔ ایاز رسول نازکی نے بھی اس موضوع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس موضوع کو یوں پیش کرتے ہیں:

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر
تیرے سولہ، میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

☆

وقت رہتے ہم چلیں اس شہر سے
اب یہاں اپنی بسر ممکن نہیں

☆

پرندے یہاں سے گزرتے تو ہیں
یہاں پر بناتے نہیں آشیاں

☆

ہم بھی جموں کے ہوگئے آخر
ہم نے ایسا نگر نہیں دیکھا

☆

ہم جو کشمیر سے نکلے ہیں تو جموں ٹھہرے
دشتِ غربت میں کہیں پر تو ٹھکانا ہوگا

ایاز رسول نازکی کے یہاں حالات کا گہرا شعور ہے کیونکہ وہ ان حالات کے ناظر اور صورت گر دونوں رہے۔ان کی غزلوں میں بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر افراد کی جذباتی اور ذہنی کیفیات کے نقشے بھی ملتے ہیں۔غرض ایاز رسول نازکی کی شاعری عصری شعور کے حوالے سے قابلِ تعریف اور قابلِ داد ہے۔

ان کی غزلیہ شاعری کی پوری اساس روزمرہ سے جڑی ہوئی ہے۔کشمیر پچھلی کئی دہائیوں سے جس خاک وخون سے گزرا ہے،شاعر نے جن حالات میں زندگی کے شب وروز گزارے ہیں اور جن سے لوگ یہاں نبرد آزما ہوئے ،اس کا اظہار پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ اشعار میں ملتا ہے۔دراصل ان کی شاعری عصری حالات اور واقعات کا آئینہ ہے جس کا اعتراف وہ بخوبی کرتے ہیں۔

جو غزل بھی کبھی کہی ہم نے
دفترِ واقعات ہے پیارے

ایاز رسول نازکی کی غزلوں میں تکلف اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔کیونکہ وہ

ایک سادہ اور پُر خلوص انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔خلوص اور صداقت اس کا جوہر ہے، سادگی اور صفائی اس کی جان ہے۔روانی اور تہہ داری، شگفتگی اور سہل بیانی اس کے اسلوب کی پہچان ہے۔وہ سیدھے سادے انداز میں زندگی کی تلخ حقیقتوں اور سچائیوں کو اس قدر بے ساختگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جذبوں کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔مثلاً

وحی اُترے قلم پر نازل ہوں　　شعر کاغذ پہ آیتوں کی طرح

☆

رگوں میں دوڑتا تو سرخ ہوتا　　لہو آنکھوں میں پانی ہو گیا ہے

☆

ایک نیزے پہ آج سورج تھا　　سر کو چھو کر وہ آسمان گزرا

اب ایسے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں، جن میں تغزل اور مضمون آفرینی کا جوہر پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

سیکھنے سے ہنر تو آتا ہے　　شاعری میں اثر نہیں آتا

☆

اس کا اپنا ایک ہنر تھا　　لفظوں کا وہ جادوگر تھا

☆

خط ِکوفی میں وہ ابرو لکھنا　　خطِ گلزار میں گیسو لکھنا

☆

زمانہ مرے ساتھ تب بھی نہ تھا　　مگر تم مرے خیر خواہوں میں تھے

ایاز رسول نازکی زبان و بیان کی صفائی، سلاست اور شستگی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔وہ فلسفے کی پیچیدگیوں اور گنجلک موضوعات سے پرہیز کرتے نظر آتے ہیں۔ان

کے یہاں اکثر وہی الفاظ وتراکیب ،محاورے وبندشیں ،تشبیہات واستعارے، کنارے اور اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں جن سے ان کے اشعار میں سلاست وروانی ،تہہ داری اوراثر انگیزی میں اضافہ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے کلام کے حسن کونکھارنے اور مفہوم کے ابلاغ واظہار میں روانی پیدا کرنے کے لیے حسبِ استطاعت مختلف صنائع معنوی اور صنائع لفظی کا برمحل اور برجستہ استعمال کیا ہے جس سے ان کے کلام میں ظاہری اور معنوی حسن نکھر گیا اور ترسیلِ مطالب میں بڑی خوش سلیقگی پیدا ہوگئی۔اب ہم ان مختلف صنعات کا ذکر کرنے کی کوشش کریں گے جن سے ایاز رسول نازکی نے اپنے کلام کی آرائش وزیبائش کی ہے نیز ہر صنعت کے حوالے سے ایاز رسول نازکی کے کلام سے نمونے بھی پیش کریں گے۔

تشبیہ:۔علم بیان کی مشہور اور کثیر الاستعمال صنعت تشبیہ ہے۔تشبیہ کے لغوی معنی 'مشابہت دینا' یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا۔اصطلاح میں دو چیزوں کا کسی صفت میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کو تشبیہ کہتے ہیں۔ایاز رسول نازکی نے اپنے کلام میں صنعتوں کا خوب استعمال کیا ہے۔لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ہر صنعت میں ان کے کلام سے صرف ایک شعر پیش کریں گے۔مثلاً

پھول سے وہ لب اگر کھلنے لگیں
گلستان سا وہ دہن ہے ہوشیار

استعارہ:۔لغوی اعتبار سے استعارہ کے معنی 'مانگنا' یا 'مستعار لینا'۔علم بیان کی اصطلاح میں اس صنعت سے مراد حقیقی اور مجازی معنی کے مابین تشبیہ کا علاقہ پیدا کرنا ہے:

عین ممکن ہے کہ تخلیق سے خالق ہو جاؤ
لاکھ چاہو بھی بت کو خدا کر نہ سکو

تضاد:۔کلام میں ایسے دو الفاظ جمع کرنا جو معنی اور وصف میں ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ یہ متضاد الفاظ اسم، فعل یا حرف ہو سکتے ہیں۔اس صنعت کو طباق یا تضاد کہتے ہیں:

خیر کے بدلے شر پسند ہوا
غیر تم کو اگر پسند ہوا

تلمیح:۔شعر میں کسی آیتِ قرآنی، حدیث نبوی، کسی مشہور واقعہ، قصہ یا کسی مذہبی، حکایتی، علمی اصطلاح کی جانب اشارہ کرنا یا ان اصطلاحات کو اپنے کلام میں استعمال کرنا، جسے سمجھے بغیر کلام کا مطلب واضح نہ ہو۔اسے صنعت تلمیح کہتے ہیں:

اب تو فرعون کی تقدیر کا سورج ڈوبا
آج سورج کو ہتھیلی پہ اگانا ہوگا

تجنیس:۔شعر میں دو ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو حروف، صوت اور اعراب میں مساوی ہوں لیکن معنی کے اعتبار سے دونوں مختلف ہوں:

بول تو میٹھے بول رہا ہے
اس کے دل دھڑکن میں کیا ہے

حسنِ تعلیل:تعلیل کے لفظی معنی ہیں وجہ بیان کرنا، علت بیان کرنا۔شاعر اپنے تخیل سے کسی چیز یا امر کی کوئی ایسی وجہ بیان کرے جو دراصل اُس کی علت نہیں ہوتی، مگر شاعرانہ جدت و نزاکت کے ساتھ بات واقعہ اور فطرت سے مناسبت رکھتی ہو تو اسے حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔مثلاً

میرے آنگن آ کے رویا رات بھر
پاس کی بستی کا وہ بوڑھا چنار

مراعات النظیر: اصطلاح میں مراعات النظی سے مراد یہ ہے کہ کلام میں

ایسے الفاظ یا تراکیب کا استعمال کیا جائے، جن میں باہم مناسبت ہو مگر یہ مناسبت تضاد و تقابل کی نہ ہو:

ہر ایک پیڑ کی ہر شاخ ثمر پہ پہرا ہے

تجاہل عارفانہ: لغوی اعتبار سے تجاہل عارفانہ کے معنی جان بوجھ کر انجان بننا ہے۔ اصطلاح میں کسی چیز کے بارے میں واقفیت کے باوجود عدمِ واقفیت یا بے خبری ظاہر کرنے کو تجاہل عارفانہ کہتے ہیں:

تم نے دیکھا ایازؔ کو صاحب
نازکی ہے نزاکتوں کے بغیر

ایہام: ایہام کے لفظی معنی ''وہم میں ڈالنا'' کے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے شعر کا مطالعہ کرنے سے قاری تھوڑی دیر کے لئے وہم میں پڑ جاتا ہے۔ اصطلاح میں ایہام کا مطلب کلام میں ایسا لفظ لانا ہے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب اور دوسرا معنی بعید۔ سامع یا قاری کا ذہن فوراً قریب کے معنی کی طرف جائے لیکن شاعر کی مراد بعید کے معنی سے ہو:

سایا مجھ پر کسی کا ہے شاید
لوگ کہتے ہیں میں اثر میں ہوں

سیاق الاعداد: سیاق کے لغوی معنی حساب، گنتی اور حساب کے قاعدے وغیرہ۔ اصطلاحی اعتبار سے جب شاعر اپنے کلام میں اعداد کا استعمال کرے۔ وہ اعداد چاہیے ترتیب وار ہوں یا بے ترتیب۔ اس صنعت کو سیاق الاعداد کہتے ہیں۔ ایازؔ صاحب نے مفرد اشعار کے علاوہ اس صنعت میں ایک مکمل غزل لکھی ہے۔ بطورِ نمونہ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

آس میں کاٹے بیس برس اور یاس میں کاٹے بیس برس
کچھ نہ پوچھ ہم نے کیسے کاٹے ہیں چالیس برس

فوق النقاط: اس صنعت کا نام ہے جس میں یہ التزام ہوتا ہے کہ جتنے حروف نقطہ دار استعمال کیے جائیں ان سب کے نقطے اوپر ہوں اور کوئی ایسا حرف استعمال نہ کیا جائے جس کے نقطے نیچے ہوں۔ مثلاً

ہمہ تن گوش اسی طرح زمانہ ہوگا
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور فسانہ ہوگا

تحت النقاط: وہ کلام جس میں ایسے نقطے دار حروف استعمال ہوں جن کے نقطے نیچے لکھے جائیں۔ مثلاً

ابر آئے گا دبے پاؤں کہاں جاؤ گے
باڑ میں ڈوب گیا گاؤں کہاں جاؤ گے

منقوط: وہ کلام جس کے تمام حروف نقط دار ہوں۔ مثلاً

خون بہتا نہ شاہراہوں میں
عقل ہوتی جو بادشاہوں میں

ایاز رسول نازکی کی غزلیہ شاعری کا بغور مطالعہ کرنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں مختلف طرح کے مضامین راہ پا گئے ہیں ان میں جن مضامین کی فراوانی ہے وہ سماجی کرب، روزمرہ زندگی کے معاملات و مسائل، حسنِ کشمیر اور کشمیریوں کا درد ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایاز رسول نازکی نے کسی ادبی تحریک، رجحان یا فلسفے کے تحت شعر نہیں کہے۔ میرے خیال میں وہ کسی تحریک یا رجحان کو شاعر اور شاعری کے لیے مضر اور ضرر رساں تصور کرتے ہیں کیونکہ شعری تجربہ خارجی عوامل سے اثر پذیر

ہونے کے بعد فنکار کے باطن اور اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جانے کے بعد معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اس لئے اسے آزاد ہی رہنا چاہیے۔ اس پر کسی تحریک یا رجحان کا لیبل لگانا اس کی معنویت کو محدود کرنے کے مترداف ہے۔ فن آزاد ہے اور اسے آزاد ہی رہنا دینا چاہیئے، یہی ایاز صاحب کا بنیادی وطیرہ ہے۔

☆☆☆

☆.....محمد یوسف ٹینگ

آغا اشرف علی: استاد، عاشق اور کیمیا گر

آغا اشرف علی کی 2020ء میں رحلت کے بعد مجھے اُردو اخبارات کی وہ اصطلاح یاد آئی جو بہت سے بڑے چھوٹے حضرات کی وفات کے وقت استعمال کی جاتی ہے.....''ناقابلِ تلافی نقصان''۔ایسے حضرات نے ضرور کوئی اچھے اور عمدہ کام کئے ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔لیکن میری حقیر رائے میں 2020ء نہ صرف کشمیر کے علم وادب، اس کی شاندار اِنسانی میراث، اس کا حُسنِ سلوک، اِس کی دریا دلی اور دہر شناسی کا جو واقعی ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے وہ کشمیر کے اُفق سے اُن کے غائب ہونے سے ہوا ہے۔

آغا صاحب نے بڑی لمبی عمر پائی.....وہ 18 اکتوبر 2020ء کو اپنا 98واں سال پورا کر کے 99 کے طاق عدد میں قدم رکھتے۔لیکن اُن کا کشمیر کے مطلع سے غروب ہو جانا ایک بڑی سانحہ تھا۔دُنیا بڑے سے بڑے آدمی کے انتقال کے بعد بھی اپنی رفتار نہیں بدلتی لیکن جن لوگوں کو آغا صاحب سے ملنے جلنے، اُن سے باتیں کرنے اور اُن سے سیکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے، وہ اُن کی کمی کو اپنی آخری سانس تک محسوس کرتے رہیں گے اور اِس کی کسک سے دُکھتے رہیں گے۔اُن کے ہمہ وقت تبسُم آمیز چہرے اور اُن کے طرزِ سلام وکلام کو کبھی فراموش نہ کر پائیں گے۔اُن کی ذات

میں بڑی اچھی خوبیوں کا سنگم ہو گیا تھا، جس کی نظیر آج کی زندگی میں بہت کمیاب ہے۔ بقول مُلا غنی کاشمیری

حُسنِ سیاہ آنجا گر است خال خال است

آغا صاحب گو کہ اپر مِڈل کلاس کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر کے نادر قزلباش کنبے کے فرد تھے لیکن اُنہوں نے کبھی اپنی خاندانی وجاہت کو اپنی عمومیت (Ordinariness) یا مقامیت پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ بڑے خوش کلام، خوش پوش، نوش خور اور خوش خصال تھے لیکن انہوں نے اس عمومیت کو زرتابی کی کرنوں سے کبھی دبنے نہیں دیا۔ وہ بنیادی طور پر اُستاد تھے اور اچھا اُستاد طالبِ علم کو عوامی سطح پر اُٹھانے کے لیے خود پہلے اُن کی سطح پر اُترتا ہے تا کہ وہ اُسے اپنا رفیق اور شفیق سمجھ کر اُس کے سبق کو بانہیں پسارے اپنائے اور آہستہ آہستہ اُس کی ذہنی سربلندی کے میدان میں پہنچ کر اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر آگے چلتا رہے اور اُس منزل کی طرف بڑھتا رہے جس کا تعین اور تقرر اُس کے اُستاد کی دور بین نظر میں موجود رہتا ہے۔ آغا صاحب کے حُسنِ کردار کی یہی خوبی اُنہیں اپنے دور کا سب سے بڑا کشمیری اُستاد بننے کی وجہ بنی۔ وہ علوم ماضی اور حال کے بحرِ بیکراں تھے لیکن اس بحر کے غوط خوروں کی مناسب تربیت اور حفاظت کے لیے وہ ہر وقت فکر مند اور تدبّر آراستہ ہوتے تھے۔ راقم نے جب اُن کو پہلے دیکھا تو وہ سرینگر کے ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے۔ اُنہوں نے اپنے تدبر اور حسنِ عمل سے اِس ادارے کو ایک یونیورسٹی کی طرح نکھارا اور سنوارا تھا۔ اُن سے ہر کوئی کسی بھی وقت مل سکتا تھا۔ جب ملاقاتی اُن کے دفتر میں داخل ہوتا تو وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ What a pleasure کہہ کر اُس کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے تھے۔ اُنہوں نے اِس کالج میں ایک آڈیٹوریم بھی بنوایا تھا جس میں دنیا بھر کے مشاہیر، مفکروں اور دانشوروں کے اقوال

دیواروں پر کپڑے کے بینروں پر نظر آتے تھے۔ یہاں آئے دن مختلف علمی، ادبی، ثقافتی تقریبات ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دن ایسا آیا جب اِس کوتاہ علم خاکسار کو وہاں آغا صاحب کے حوالے سے ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ میں سٹیج پر چڑھا تو خود آغا صاحب حاضرین کی ایک صف میں ہال میں تشریف فرما تھے جب میں نے مقالہ ختم کیا تو محفل کے صدر نے حاضرین کو مقالے کے بارے میں سوالات پوچھنے کی دعوت دی۔ ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ آغا صاحب کو اُستادوں کے اُستاد بتاتے ہیں مگر اِنہوں نے تو کوئی کتاب بھی نہیں لکھی۔ خوش بختی سے میں نے گھبرانے کے بجائے مائیک پہ جواب دیا ''مگر قدیم یونان کے حکیم سقراط نے بھی تو کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ مگر افلاطون اور ارسطو اُن کے تلامذہ میں سے ہیں۔'' ہال میں تالیاں بج اُٹھیں اور آغا صاحب بدستور نیچے بیٹھے ہوئے مسکراتے رہے۔ اُس کے بعد جب وہاں کوئی تقریب ہوتی تو مجھے حاضری کا کارڈ موصول ہوتا اور وہاں پر بڑے بڑے جگادری، کبھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بلکہ کبھی بیرونِ ہند کے بڑے بڑے علما اور فضلا بھی ہوتے تھے اور میں اُن کو سُن کر اپنی جانکاری کے چھوٹے پیالوں کو شرابور کر کے گھر واپس آتا۔

آغا صاحب نے زندگی میں بڑی اونچ نیچ دیکھی۔ ایک وقت جب میں دیہات سُدھار کے محکمے میں ایک معمولی ملازم تھا تو وہ اس محکمے کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن دنوں وہ خاص طور پر بڑے شُستہ مگر سستے کپڑے پہنتے رہتے تاکہ اِس محکمے کا ادنیٰ ملازم کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ چنانچہ بارہا اِس محکمے میں جس کا صدر دفتر اُن دنوں اِشبر، شالیمار کے اُن بنگلوں میں تھا جہاں 1944ء میں جناح صاحب ٹھہرے تھے۔ وہاں آغا صاحب سے کبھی کبھی دورانِ تربیت بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ آغا صاحب نے اپنی سوانح عمری ''کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں'' میں خاکسار کا ذکر

فرمایا ہے اور راقم کے بارے میں ہونہار جیسا لقب استعمال کیا ہے۔

آغا صاحب کی زندگی کا ایک اور طرح دار پہلو اُن کی میزبانی تھی۔ وہ اپنی ۹۰ ویں سال گرہ تک عموماً جاڑے میں کشمیر سے باہر رہتے تھے لیکن گرمی کے موسم میں کئی بار وہ اپنے گھر میں دعوتیں کرتے تھے جن میں اُن کے کچھ معاصر، کچھ دوست اور کچھ اُن کے ہمسائے اور اُن کے فارغ التحصیل شاگرد وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اُن کی خواتین احباب جن میں زیادہ تر امریکی اور یورپی خواتین شامل ہوتی تھیں، موجود رہتیں۔ ان محفلوں میں طعام میں کشمیری ضیافتوں کے علاوہ کچھ (Continental cusine) بھی موجود رہتے۔ آغا صاحب کو خود کچن میں رہ کر کچھ اشیائے خوردنی تیار کرنے کا شوق بھی تھا۔ اُن کی سال گرہ 18 اکتوبر کی نشست بہت خاص ہوتی تھی۔ میں نے کشمیر کی پُر لطف ضیافت ہریسے کا مزہ رات کے کھانے کے ساتھ اُن کے یہاں لیا تھا۔ ہریسہ کڑاکے کی سردی میں کشمیری صبح سویرے مزے لے لے کر تناول کرتے رہے ہیں اور یہ سرما میں کشمیر کی خصوصی نعمتوں میں شمار ہوتی ہے۔ لیکن آغا صاحب خود بہت اچھا ہریسہ تیار کرتے۔ Soup وغیرہ نوش کرنے کے بعد ہریسہ آتا۔ ہریسہ چونکہ گھر میں تیار ہوتا لہٰذا کسی آمیزش کے بغیر ہوتا اور اس لیے بہت لطیف و مہکدار ہوتا تھا۔ اُس کے بعد دوسری لوزیات یکے بعد دیگرے آیا کرتیں۔ لیکن محفل کی اصل خوبصورتی وہاں کی پُر مغز اور مُدّلل گفتگو اور مکالمے ہوتے۔ حاضرین الگ الگ موضوعات پر بڑی شائستگی سے تبادلہ خیالات کرتے اور جب خود آغا صاحب سخن سرا ہوتے تو یوں لگتا کہ ہم افلاطون کی اکیڈمی میں نُکتہ آرائیوں سے منور ہو رہے ہیں۔ اِس گفتگو کو اُن کا بہت ہی سلجھا ہوا احساسِ ظرافت Sense of Humour اور بھی زیادہ چمکاتا دمکاتا تھا۔ ایک بار رومانی معاملات پر بات ہو رہی تھی تو اُنہوں نے فرمایا کہ اِس فانی دُنیا کو حسین عورتیں افلاک و آفاق سے زیادہ تر طرح دار بناتی ہیں کیونکہ

ایسا خود دستِ قدرت کی منشا اور مقصود ہوتا ہے۔ آغا صاحب دوسری کئی زبانوں کے کیمیا گر تھے لیکن فارسی سے کم وابستہ تھے۔ لیکن ایک دن اُنہوں نے ترنگ میں آ کر نسوانی حسن کے بارے میں یہ شعر پڑھا

روئے نیکو معالجہ عُمرِ کوتاہ است
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

(خوبصورت چہرہ عمر کی کوتاہی دور کرنے کا بہتر علاج ہے اور میں نے اِس نسخہ کو خود مسیح کی بیاض سے نقل کیا ہے۔)

آغا صاحب کو قدرت نے جو حسنِ کلام عطا کیا تھا۔ اُس کا بیان الفاظ میں ادا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ انہوں نے غضب کا حافظہ پایا تھا۔ جونہی اُن کی طلاقت لسانی کا فانوس روشن ہو جاتا تو الفاظ کے ساتھ وقوعات بھی کرنوں سے جگمگ جگمگ ہونے لگتے اور ان کا نور سامعین کے ذہنوں میں بھی گویا جشنِ چراغاں برپا کر دیتا۔ وہ زیرِ بحث معاملامت یا کتابوں کا ذکر کرتے تو وہ کتابوں کے اقتباسات کسی لکنت کے بغیر ایک آبشار کی روانی اور جولانی کے ساتھ ادا کرتے۔ کچھ اِس دِلرُبائی کے ساتھ کہ سامعین کی بصارت سیراب اور بصیرت شاداب ہونے لگتی۔ وہ سچ مچ منطق اور نکتہ سرائی کے جادوگر تھے۔

آغا صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ بڑا اُنس رکھتے۔ اور کہتے کہ اُستاد کا سب سے مایہ ناز لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے شاگرد کو اپنے سے آگے نکلتا ہوا دیکھے۔ ایک بار جب راقم کلچرل اکیڈیمی کا سیکرٹری تھا اور میں نے حسبِ معمول اُن کے اعزاز میں ایک محفل سجانے کا بندوبست کیا اور پھر اُنہیں اکیڈیمی کے قلمی نسخوں کی لائبریری کا مشاہدہ کروانے کے بعد اُن کی خدمت میں اکیڈیمی کی شائع کردہ مطبوعات کا ایک سیٹ اُن کو پیش کیا تو اُنہوں نے از راہ کرم خاکسار کے بارے میں کچھ ایسے الفاظ ادا

فرمایئے کہ میں اپنی کوتاہی کا احساس کر کے پسینے پسینے ہو گیا۔

آغا صاحب اپنے آخری ایام میں اپنے راج باغ، سری نگر کے گھر میں کچھ تنہا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے کبھی حکومت کی سکیورٹی قبول نہیں کی۔ اِس لیے اُن کے گھر ''صوفیہ نشان'' میں آدمی کسی روک ٹوک کے بغیر اندر جا سکتا تھا۔ وہ اپنے چمن زار، جو بہت ہی نامانوس مگر حسین اور خوشبودار پھولوں سے مہکتا رہتا تھا۔ وہ اپنے گھر کے برآمدے پر کرسی پر بیٹھے نظر آتے۔ جوں ہی وہ اندر آنے والے کو دیکھتے تو کھڑے ہو کر مردوں سے گلے لگتے اور خواتین کے ساتھ مصافحہ کر کے اپنا مرغوب محاورہ "What a pleasure" ادا کرتے۔ گفتگو کے غنچے چٹکنے لگتے اور علوم کے سمندر کی لہریں مچلنے لگتیں۔ اُس کے بعد حسبِ وقت چائے، لنچ وغیرہ کی بھی نوبت آجاتی کہ قاری اِس حسنِ کلام کی چاشنی سے دُنیا جہاں کو بھول کر وہیں پر گویا مقناطیس کی کشش سے لِپٹ چِپٹ جاتا۔ ایک بات جو ہمیشہ ہمارے دل میں کھٹکتی رہے گی کہ اُنہیں کشمیر یونیورسٹی کا وائس چانسلر نہیں بنایا گیا اور وہ بھی سیاسی اور ذاتی وجوہات کی بنا پر۔ حالانکہ اُن سے بہت کم پایہ افراد اُن کے جیتے جی اِس منصب پر رہے۔ اگر آغا صاحب اس عہدے پر ہوتے تو وہ واقعی اِس میں چار چاند لگا دیتے۔

آغا صاحب نے کشمیر خصوصاً شہر سری نگر کے مڈل کلاس کے شایقین علم کو معمول سے ہٹ کر دُنیا جہان سے متعلق الگ الگ ثقافتوں اور تہذیبوں سے روشناس کرنے اور اُنہیں بحرِ الکاہل سے بھی بڑے بحرالعلوم میں غوطہ خوری کرنے اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق وہاں سے گوہرِ شاندار اور دُرِ شاہوار اکٹھا کرنے کا چسکا لگایا۔ میرے ایک اور اُستاد جو اَب بھی فضل خدا سے سلامت ہیں۔ پروفیسر میر نصیر اللہ (اِن کا 2021ء میں انتقال ہو گیا ہے) کالج میں کیمسٹری کے لیکچرر تھے۔ آغا صاحب سے اُن کو ملنے کا اتفاق ہوا تو اُنہوں نے اُن کے جوہرِ قابل کو پہچان لیا۔ وہ اُن کو اُن کے

سبجیکٹ سے علاوہ ثقافتی اور ادبی نوعیت کی کتابیں دینے لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک بڑے ثقافت شناس بن گئے۔ چنانچہ اب وہ اپنی عمر کی دسویں دہائی میں چل رہے ہیں اور اُنہیں علامہ اقبالؔ، مرزا غالبؔ، فیض احمد فیضؔ اور دوسرے ادبی سورماؤں کے شعراز بر ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے کہ مجھے اِس بساط پر آغا صاحب نے ہی بٹھایا اور وہی میری آتشِ شوق کو بار بار بھڑکاتے رہے۔ ایسے کتنے ہی اور کشمیری رہے ہیں جو آغا صاحب کی منقل سے علم و ادب کے شرارے چُن کر ساری فضاؤں کو روشن کرتے رہے۔ خود یہ خاکسار اُن سے ذرا دیر کے بعد ملا۔ لیکن اُنہوں نے مجھے اُردو اور کشمیر کی ڈل جھیل اور وُلر سے نِکال کر عالمی ادب کے بحرِ قلزم سے آشنا کرانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی پچاسی ویں سال گرہ تک امریکا وغیرہ جاتے اور اپنی پسند کی شاندار کتابیں لے کر آتے اور اپنے حلقہ احباب کو پہلے وقت ایک کتاب دیتے لیکن اِس کی شرائط خاصی سخت تھیں۔ یعنی کتاب کو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے رکھا جاسکتا تھا۔ اِس کے بعد کتاب بہرحال واپس کرنی ہوتی۔ کتاب واپس حاصل کرنے کے وقت وہ قاری سے اِس کے مندرجات اور موضوعات کے متعلق طرح طرح کے سوال کرتے تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ دارندہ نے اس کو واقعی پڑھا ہے۔ اگر کتاب کے متعلق قاری کے ذہن میں کوئی اُلجھن ہوتی تو وہ اس کے سوال سُن کر ایک سچے اُستاد کی طرح اُس کو سمجھا بجھا کر اس کو مطمئن کرتے۔ اگر قاری کو کتاب زیادہ پسند ہوتی تو اُس کو اِس کی فوٹو کاپی کرنے کی اِجازت دیتے لیکن کتاب ہر حال میں آغا صاحب کو امانت کی طرح واپس کرنا ہوتی۔ اِس طرح سے اُن کے پاس نایاب کتابوں کی ایسی لائبریری بن گئی تھی کہ کشمیر میں اس کی طرح داری کی نظیر ملنا مشکل تھا۔ لیکن 2014ء میں جہلم کے تباہ کُن سیلاب نے اِس طِلسمات کا بیڑہ غرق کر دیا۔ خود آغا صاحب بڑی مشکل سے چھت پر مُدت تک رہ کر جان بچاتے رہے۔ یہاں تک کہ کچھ خیر خواہوں نے عقدہ کُشائی کر کے کسی

طرح سے اُنہیں نکال لیا لیکن مکان میں اُن کی عمر بھر کے اثاثے کو زائل ہونے سے کوئی نہ بچا سکا۔ اگر چہ اس اثاثے میں ان کے نہایت قیمتی فرنیچر اور گھریلو سامان کا اتلاف ہوا جس میں چاندی اور سونے کی کچھ متاع بھی شامل تھی لیکن اُنہیں سب سے زیادہ رنج اپنی بیش بہا لائبریری اور تصاویر پینٹنگز کے ضائع ہونے کا تھا کہ یہ تصاویر ملک اور ریاست کے بڑے بڑے مصوروں کے شاہکار تھے۔

آغا صاحب کو اپنی طویل عمر میں بڑے جان کاہ صدموں سے دوچار ہونا پڑا جس میں اُن کے مکان اور لائبریری کے خسارے کے علاوہ اُن کے عالمی شہرت کے شاعر بیٹے آغا شاہد علی کا انتقال تھا۔ جنہوں نے انگریزی میں "A Country Without Post Office" جیسی شعری تخلیق امریکہ سے شائع کرائی۔ اِس کتاب کے اُسلوب کی اس قدر توصیف اور تعریف ہوئی کہ اِس کے دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمے کئے گئے اور اِسے اعلیٰ انعامات واکرامات سے نوازا گیا۔ آغا صاحب پر اِس صدمے سے کیا گُزری ہوگی اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے لیکن وہ سقراط کی طرح Hemlock کے یہ پیالہ نوش کر گئے اور خاموش رہے۔ اُن کے بڑے قابل اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک برادران آغا شوکت علی، آغا ناصِر علی اُن کے ہوتے ہوئے عاقبت کو سدھار گئے اور وہ اپنے آنسوؤں کو خود پیتے رہے اور صبرِ ایوب کا مظاہرہ کرتے رہے۔ لیکن گریہء یعقوب سے گریز کرتے رہے۔[۳] اُن کی والدہ بیگم ظفر علی جنہوں نے کشمیر میں خاص طور نسوانی تعلیم کے سلسلے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور اس میں ایک Pioneer کی حیثیت سے کام کیا، اُن کے راج باغ، سری نگر کے چمن زار میں ہی قیام پذیر تھیں۔ مگر اپنے چھوٹے اور ایک مکانچے میں۔ آغا صاحب صبح وشام ان کی خیر خیریت دیکھنے اور اُن کی خاطر داری کے لیے آتے جاتے تھے۔ لیکن والدہ اپنے طرزِ زندگی کا شعار نبھانا چاہتی تھیں۔ اُن کو خاصی اچھی پینشن بھی ملتی تھی اور وہ

کسی پر اپنی زندگی کی شام میں بوجھ بننا نہیں چاہتی تھیں۔ دوسرے وہ اپنے اِقبال مند اور ملنسار بیٹے کے طرزِ زندگی میں بھی حائل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لئے وہ چند گز دور رہنا پسند کرتی تھیں۔ اُن کی اپنی سہیلیاں، شاگرد وغیرہ کا الگ حلقہ تھا اور صاحبِ ثروت ہونے کے سبب نوکر چاکر اور دوسری آسائشوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ اِس لئے وہ پاس ہوتے ہوئے بھی ذرا دور رہنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ وہ جب تک حیات رہیں اِسی طرح بسر کرتی رہیں۔ 2014ء کے طوفانی سیلاب میں اُن کا یہ چھوٹا سا آشیانہ بھی ڈھ گیا اور پھر آغا صاحب کے چمن زار کی ایک کیاری کی طرح لہکنے مہکنے لگا۔

آغا صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے اور جنت مکین ہو چکے ہیں۔ ایک خلش اُن کے جاننے والوں کے دِلوں میں کانٹے کی طرح چبھتی رہے گی کہ اُنہیں جامعہ کشمیر کا قائم مقام وائس چانسلر بنانے کے باوجود اِس کا مستقل شیخ الجامعہ نہیں بننے دیا گیا۔ حالانکہ اُنہوں نے اپنی جوانی کا بڑا حصہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں گُزارا تھا۔ جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین جیسے بے لوث اور مفادِ قومی کے جذبہ سے سرشار اُستادوں نے عزتِ افزائی کے لیے معیار قائم کئے تھے۔ آغا صاحب کی زندگی میں اُن سے کم پایہ کئی لوگ اِس منصب پر رہے لیکن آغا صاحب کو ذیلی اور غیر اہم اداروں میں چہل قدمی کے چھوڑ دیا گیا۔ اگر وہ اِس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے ہوتے تو میرے خیال میں وہ اِس کو اپنی روشن خیالی سے نرالی آن بان عطا کرتے اور اس میں چار چاند لگاتے۔

آغا صاحب کی یاد تو بڑی دیر تک اُن کے جاننے والوں کو تڑپاتی رہے گی لیکن یہ دریائے لطافت ایک خاکی تن بدن میں آیا تھا اور اُن کو بہر حال واپس اپنے خالق کے بُلانے پر جانا تھا لیکن ہم سب اُن کو یاد کرتے ہوئے یہ شعر گنگناتے رہیں گے ؎

جوہری بند کیے جاتے ہیں دوکانِ سخن
ہم کسے دولتِ الماس وگہر بیچیں گے

☆

حاشیہ:

ا۔اُستاد: بنیادی طور پر زرتشت کے زمانے کی پہلوی زبان کی ترکیب ہے جو اُس مذہب یعنی پارسیوں کی بائبل ''ژند اوستھا'' کے حوالے سے ہے۔اُس زمانے میں جو شخص اِس کتاب کو زبانی یاد کرتا یا اِس کی معنوی گہرائیوں کا شناور ہوتا اُس کو اُستاد کہتے۔لیکن ''حافظِ اوستھا'' اُس کے لیے استعمال کیا جاتا۔ بعد میں جدید فارسی میں اُس کا تلفظ اُستاد ہوگیا یعنی جو کسی علم کا ماہر یا معلم ہو۔اردو اور کشمیری زبانوں میں بھی اُستاد ہی کہلایا یعنی Teacher ۔ اِس کے معنی وسیع تر ہوتے گئے مثلاً تاج محل آگرہ کا ڈیزائن تیار کرنے اور دوسرے کاریگروں کی نگرانی کرنے والے Architect کو اُستاد احمد لاہوری پُکارا جانے لگا۔اِسی طرح بڑے موسیقاروں کے گھرانے اُبھرنے لگے، تو اُن کو اُستاد کہہ کر یاد کیا جانے لگا۔مثلاً اُستاد بڑے غلام علی خان، اُستاد امیر خان وغیرہ۔کشمیری میں اِس کے معنی اور وسیع ہو گئے ۔مثلاً موسیقاروں میں اُستاد غلام محمدؐ قالین باف، اُستاد محمدؐ عبداللہ تبت بقال، اُستاد رمضان جُو، اُستاد کمال بٹ وغیرہ۔کشمیری میں دوسرے فنون اور کسب ہنر کرنے والوں کو بھی اُستاد کہتے ہیں ۔مثلاً قالین بافی کے ماہر، شال بافی کے ماہر، ماہر نجار، ماہر لوہار، ماہر سنار۔ یہاں تک کہ کشمیری وازہ وان بنانے والے ماہر بھی اُستاد کہلاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حجام کو بھی اُستاد کہا جاتا ہے۔کشمیری تکیہ کلام ''وستہٕ'' اوستھائی ترکیب کے زیادہ قریب ہے۔

۲۔آغا صاحب کی اہلیہ صوفیہ دراصل لکھنو سے تھیں اور اس لئے اہل زبان

بھی تھیں۔اُن کا پورا نام صوفیہ نعمانی تھا۔اُن کا اُردو بولنے کا اسلوب اِتنا اعلیٰ تھا کہ ہم کشمیری اُس کی نقل بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتے تھے۔ایک بار میں اور میرے مرحوم دوست شمیم احمد شمیمؔ سرینگر کے کانونیٹ اسکول جس کے عقب میں آغا صاحب کی رہائش گاہ تھی کے پاس گھاٹ میں دوسرے کنارے جانے کے لیے کشتی میں بیٹھے۔صوفیہ صاحبہ پہلے ہی کشتی میں سوار تھیں۔شمیم صاحب جو ایک بڑے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر کا شاندار اخبار ''آئینہ'' نکال رہے تھے اور خود بھی بہت شُستہ اُردو بول سکتے تھے۔جب کشتی چلنے لگی تو شمیم صاحب کو صوفیہ صاحبہ سے کوئی سوال کرنے کی سوجھی۔شمیم صاحب نے سوال کیا تو صوفیہ جی نے ذرا تنک مزاجی سے جواب دیا ''پہلے صحیح اُردو میں سوال کرو، پھر جواب دیا جائے گا۔''شمیم مرحوم دنگ رہ گئے۔صوفیہ جی آغا صاحب کو بہت پیاری تھیں جو نہ صرف اپنے سلیقے سے گھر سنبھالتیں اور بچوں کی تربیت کرتی بلکہ اپنی زبان و بیان کی طرح داری سے بھی سبھی کو متاثر کرتیں۔شومئی قسمت سے وہ آغا صاحب سے عشرہ سے زیادہ عرصے پہلے انتقال کر گئیں۔اُن کے جانے سے گھر کی سب رونق ماند پڑ گئی اور آغا صاحب اُن کو یاد کرتے ہوئے بہت ملول رہتے۔اُنہی کی نسبت سے اُنہوں نے 2014ء کے سیلاب کے بعد اپنے مکان کا نام ''صوفیہ نشان'' رکھا اور یہ بھی اپنی خاص انفرادیت لیے ہوئے ہے۔کشمیر کے اُمرا اور شرفا اپنی بڑی بڑی کوٹھیوں اور حویلیوں کا نام ''منزل''، ''کدہ''، ''مقام'' وغیرہ رکھ لیتے ہیں لیکن ''صوفیہ نشان'' وادی میں واحد ایسا نام ہے۔مجھے حسبِ حال علامہ اقبالؔ کا شعر یاد آ رہا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بہ لبِ اوست

☆☆☆

☆.....پروفیسر محمد اسد اللہ وانی

شیخ علی محمد ماہرؔ: ایک ادیب، ایک فن کار

شیخ علی محمد ماہرؔ کشمیر میں اردو اور کشمیری زبان کے ایک ایسے ادیب کا نام ہے جنھیں زندگی کی کچھ ہی بہاریں دیکھنا نصیب ہوئیں۔ وہ مائسیمہ بازار کے دبجی محلّہ میں 22 مئی 1955 کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ بیوہ ماں کے علاوہ ان کے دو چھوٹے بھائی محمد یعقوب اور مشتاق احمد تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بیوہ ماں کے سر پر اچانک بچوں کی کفالت کا بوجھ آن پڑا جسے ماہر نے اپنی کم عمری کے باوجود احسن طریقے سے نبھانے کی کوش کی۔

علی محمد ماہرؔ کے بعد محمد یعقوب اپنے بڑے بھائی ماہرؔ کی جگہ محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز میں ملازم ہوئے اور اب سبکدوش ہو کر بٹہ مالو میں اپنا مکان تعمیر کر کے گھر گرہستی کے کاموں میں مصروف ہیں جب کہ مشتاق احمد اپنے آبائی گھر میں رہ کر پیری مریدی اور درویشی کا کام کرتے ہیں۔

علی محمد ماہرؔ کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ وہ اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن کافی ذہین و فطین تھے۔

یہ 1979ء کی بات ہے جب کلچرل اکیڈمی کے اربابِ بست و کشاد نے نوجوان ادبا اور شعرا کی تخلیقات پر مبنی ہر سال شیرازہ کا خاص شمارہ "نوجوان نمبر" کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جو اکتوبر۔نومبر میں کئی برس تک ہر سال شائع ہوتا

رہا۔اس تعلق سے شیرازہ کے پہلے نوجوان نمبر کے لیے جن قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہوئیں ان میں علی محمد ماہرؔ کی چار غزلیں مع ایک فوٹو کے تھیں جنھیں شیرازہ "نوجوان نمبر" جلد 18، شمارہ 6 بابت اکتوبر۔نومبر 1979 میں شائع کیا گیا۔ ماہرؔ اس نوجوان نمبر کے شائع ہوکر آنے اور تقسیم ہونے سے قبل یعنی 12 فروری 1980ء کو فقط 24 سال 8 ماہ اور 20 دن کی عمر میں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگئے۔

علی محمد ماہرؔ محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز میں ملازمت کرتے تھے۔ مرحوم کو اردو اور کشمیری شاعری کے علاوہ اداکاری، خوشنویسی اور مصوّری سے کافی لگاؤ تھا۔ کشمیری زبان میں ''انتظار'' اور ''جگر پارہ'' عنوانات کے تحت ان کے دو کتابچے شائع ہوئے ہیں۔ ڈرامہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسٹیج اداکار کی حیثیت سے Action Songs اور TV Skits کی پیش کش میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ وہ ایک بہترین سٹیج آرٹسٹ تھے۔ وہ کشمیر ویلی تھیٹر کے بانی ممبران میں سے تھے، جن میں سے گُل جاوید اور شیخ حنیف ابھی بقید حیات ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں وہ فٹ بال کے بھی ایک اہم اور قابلِ ذکر کھلاڑی تھے۔

ماہرؔ کے بارے میں راقم کے ساتھ فون پر بات کرتے ہوئے کشمیر ویلی تھیٹر کے بانی رکن شیخ حنیف نے کہا کہ ماہرؔ اعلیٰ تخلیقی اور اختراعی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھیں کشمیر ویلی تھیٹر کے ساتھ بے حد لگاؤ تھا اور اس کے منشور میں ان کا نام ابھی تک موجود ہے۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ماہرؔ کا کشمیری کلام دو کتابچوں کی صورت میں ''انتظار'' اور ''جگر پارہ'' کے عنوانات سے شائع ہوا ہے۔ ان دونوں کتابچوں کی Pdf کاپیاں مجھے جناب بشیر احمد قادری کی وساطت سے موصول ہوئیں۔ ماہرؔ کے کشمیری کلام کے دوسرے کتابچے ''جگر پارہ'' کی Pdf کاپی مجھے شکیل الرحمٰن نے ارسال کی تھی۔

بشیر احمد قادری نے ماہرؔ کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب انھوں نے معراج الدین وانی کے ساتھ تھیٹر کلچر کے فروغ کے لیے ''کشمیر کلچرل سوسائٹی'' کا قیام عمل میں لایا تو علی محمد ماہرؔ نے اس سوسائٹی کے ساتھ نہ صرف اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا بلکہ وہ اس کے پس پردہ بے لوث طریقے سے بہت سی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ وہ ایک پیدائشی فن کار تھے۔ اُنھیں شاعری، خوش نویسی، اداکاری اور موسیقی سے بے پناہ رغبت تھی۔ وہ یاروں کے یار بلکہ بڑے ہی یار باش تھے۔ اپنی مفلوک الحالی، عسرت اور کم مائیگی کے باوجود اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کو اپنے مسکن پر بلا کر محفلیں جماتے تھے۔ وہ بلا کے ذہین اور منکسر المزاج تھے۔

علی محمد ماہرؔ نے پہلے اپنا تخلص قاتلؔ رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کشمیری کلام کا جو پہلا مختصر سا مجموعہ "انتظار" کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس میں ان کا تخلص قاتلؔ ہی ہے۔ یہ کتابچہ فقط 30 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایک نعت شریف، 14 غزلیں اور 5 قطعات ہیں۔ اس کتابچے کی تاریخِ اشاعت 5/اکتوبر 1975 ہے جسے شالیمار آرٹ پریس نے چھاپا ہے۔ اس کتابچہ کے سارے حقوق مصنف کے نام محفوظ ہیں۔ اس کتابچے کا آغاز نعت شریف کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔

آش چھم بس چأنی، چأنی کیا چھےٚ رحمتھ بے حساب
منتظر روٗ زِتھ مےٚ لوسم زندگی ہُنٛد آفتاب
یَم زٕ دوٗشوے لال وندہے سرچشم ژےٚ کہکشاں
کائناتس گاش چوٗنٕے ژٕے جہانک آفتاب
چھُس اُچھوٕ کنٛز خون ہاران تالہٕ چھم لُجمٕژ زبان
جان وندی ژیٚے یہِ قأتل پانہٕ ییٚلہِ یکھ بے نقاب

اس کتابچے سے ماہرؔ کی کچھ غزلوں سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سُہ پیہِ نا سنا اَدِ پَنٕز دأدی باوس
واللہ سینہٕ مُژرِتھ دِلک داغ ہاوس
مےٚ گوٚو ضایہِ یاوُن جوأنی تہِ سورم
ہُجَر آم وَنہٕ کس مےٚ جانانہٕ دُورم
گُمژ ضایہ مسول لجمژ یہ داوس
واللہ سینہٕ مُژرِتھ دِلک داغ ہاوس

☆☆☆

جدأئی چأنٛز چھم وَدِناوان
کس وَنہٕ مےٚ گوٚو بُرٕ حال مَتوٕ
پوٚز محبتھ چھس بہٕ بأگراون
امارو وۄلہم زال مَتوٕ

☆☆☆

أچھن گاش لوسم متوٕ ژیٚے وُچھأنی
یہِ چھم داغ جگرس مےٚ یُس نو ژلأنی
یہِ قأتلؔ پریشان گوٚمت سبٹھاہ
ازژٕ شمع سُہ پوپُر گتھ چھے کرأنی

ماہرؔ یا قاتلؔ کے اس مختصر سے شعری مجموعے کی شاعری بحیثیت مجموعی محبوب کے تئیں اُن کی بے پناہ محبت کی ترجمان اور شباب کے ہیجان کے ساتھ ساتھ ہجر و وصال کے تصورات کا ایک ایسا دلفریب اور جان گداز مرقع ہے جو اگر چہ اُن کی غزلوں کے ہر شعر سے عیاں ہے مگر اس غزل کے ان اشعار میں اس کا نچوڑ اور عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

شوقہٕ مےٚ لیوٚکھ افسانہٕ مَتھۆ یہِ ہا چانہِ لولے
گُس بوزِ ووٚنی سُہ افسانہٕ مَتھۆ یہِ ہا چانہِ لولے
گَس ونہٕ مےٚ گوٚو بُرٕ حال متھۆ بس چانہِ دوٚ رِرَے
دل میون چھُ اَز دیوانہٕ متھۆ یہِ ہا چانہِ لولے
چھُس چون غم للّہٕ وان متھۆ کوٚت تام للّہٕ ناوَے
جانس مےٚ گوٚو فأنی فان متھۆ یہِ ہا چانہِ لولے
چھےُ وادٕ مُشِتھ مستانہٕ متھۆ کتھ یاد پاوَے
پیٚژٕ کالہٕ چھُس پیارانہٕ متھۆ یہِ ہا چانہِ لولے
گَریکھ ژٕ ووٚنی شبانہٕ متھۆ کوتاہ بہٕ زَرٕ ناوے
قأتلؔ بُری پیمانہٕ متھۆ یہِ ہا چانہِ لولے

"انتظار" عنوان کے اس شعری مجموعہ میں شاعر کے پانچ قطعات بھی شامل اشاعت ہیں۔ان میں بیان کی گئیں شاعر کی نکتہ سنجیاں ملاحظہ ہوں:

دِل چھُنہٕ ڈٔنجہِ ہے گَرٕ کیٛاہ وٕنی تَو
سٔنی تو تہٕ أنی تون سُے میٛون یار
ییٚلہِ ہُتھ سٕنو یَتھ تہِ تیٚلہِ سٔنی تَو
نَتہٕ چھُو ئلہِ گوٚ براوان بار

☆☆☆

گگرایہِ وُزملہٕ پتہٕ چھُے لاران
وَق گوٚوُے نیرتھ وَق چھُکھ ژھاران
دوہہ راتھ قأتلؔ گوٚوُے اوٚش
ہارانزوٚنہِ گاشس منز کتھ چھُکھ پیاران

گلزار ترٛأوتھ ووٛڑھ ژٕھنٛز نارَس
پزٕرَس یِکہٕ وَٹہٕ دِژ ہٕژ لَتھ
برم برم لۆگمت یَتھ سمسارَس
شیطانس ہٕتی اُلجھ ہٕژ وَتھ

ڈرامہ نویس اور افسانہ نگار شکیل الرحمٰن نے علی محمد ماہرؔ کے ساتھ اپنی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک جامع الکمالات شخص تھے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی فکر میں مصروف رہتے تھے۔ انھوں نے 1978 میں کشمیری زبان کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ اسے تعلیمی اداروں میں رائج کرنے اور مجموعی حیثیت سے اس کے فروغ کے لیے اپنے ہم خیال رفقا کے ساتھ مل کر " کاشر محاذ " نامی ایک تنظیم کو نہ صرف معرضِ وجود میں لایا بلکہ اس کے روحِ رواں کی حیثیت سے بھی قابل قدر کام کیا۔ شکیل الرحمٰن کے حوالے سے ماہر کی مندرجہ ذیل اردو غزل پیش ہے۔

زندگی ہے شام کے صحرا میں زلفیں کھول دو
لوٹ کر شاید جوانی آئے آنکھیں کھول دو
بحر ظلمت میں اگر گرداب ہے میری قبر
جی سکوں آوارہ لہروں میں بھی بانہیں کھول دو
پیار میں قسمِ وفا کھا کر میری لوٹی حیات
رشکِ گلشن ہر ادا بن جائے بانہیں کھول دو
تھام لی ہے زندگی میری ادائے موت نے
حسن کا عطیہ حسینوں کی نگاہیں کھول دو
زخمِ دل پوشیدہ ماہرؔ داغ ہیں لیکن عیاں
اس اندھیری رات میں ہاں اب راہیں کھول دو

علی محمد ماؔہر کی اردو میں یہ آزاد نظم بعنوان "تقدیر" بھی ملاحظہ ہو

تقدیر
قلم اُٹھا
میری زیست کی ریتلی دیوار پر سے
نظروں سے اُوجھل
ایک جنبش میری بے پروا
حیات کی لہروں سے ٹکرائی
تلخ اور گستاخ ہواؤں کے جھونکوں سے
میری نامعلوم کائناتِ تخیّل کی شمع بجھ گئی

علی محمد ماؔہر کی اس غزل اور آزاد نظم کے مطالعہ سے قاری کی نگاہوں کے سامنے نہ صرف حیات وممات کا ایک طلسم ابھرتا ہے بلکہ اس کے آس پاس اس کی اپنی جوان مرگی کا ہیولیٰ بھی منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

''جگر پارہ'' ماؔہر کا دوسرا کشمیری مجموعہ کلام ہے جو اگست 1977ء میں کوہ نور پریس سری نگر سے چھپا ہے۔اس کی کتابت ایک کشمیری شاعر پرتھوی ناتھ کول سائؔل نے کی ہے جب کہ اس پر پبلشر کے طور پر " کشمیر ویلی تھیٹر،سری نگر" کا نام درج ہے۔اس کے سارے حقوق مصنف کے نام محفوظ ہیں۔اس کتابچے کا ابتدائیہ پرتھوی ناتھ کول سائؔل نے ہی تحریر کیا ہے جو تین صفحات پر مشتمل ہے۔کتابچے کے آغاز میں "نذرانہ" کے تحت ماؔہر کی یہ تحریر ہے:۔

''پَنہٕ نِس بابہٕ صأبنہٕ ناوٕ تیمۍ ہہٕ جگر پارٕ زأنتھ
لولہٕ لولہٕ للہٕ نوُس تہٕ پنٕن خوٗنہٕ جگر چوٗس''

علی محمد ماؔہر کا زیرِ بحث 64 صفحات کا حامل یہ کشمیری شعری مجموعہ ایک

نعت، 23 غزلیات، 6 آزاد نظموں اور 4 قطعات پر مشتمل ہے جس کے آخر پر مرحوم کے ''شکرانہ'' کے کلمات بھی درج ہیں۔ قارئین کی خدمت میں نعت شریف میں سے تبرک کے طور پر یہ دو شعر پیش ہیں:

ژٕ للہ مےٚ کُن کر نظر یا محمد

بہٕ ابتر پیۆمُت چھُس پتھر یا محمدؐ

ژٕ چھُکھ بزم پٹھ اَز واللہ مہرِ درخشان

مےٚ گٔیہِ یاوَنس وُنی قبر یا محمدؐ

اس نعت کا یہ مصرعہ ''مےٚ گٔیہِ یاونس وونی قبر یا محمدؐ'' قاری کے رہوار خیال کو پر لگا کر نہ جانے کن انجانی راہوں کا راہی بنا دیتا ہے۔

ماہرؔ کی کشمیری شاعری کافی فکر انگیز اور خیال آفرین ہے۔اس کے مطالعہ سے اس بات کا قطعی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ کلام ایک ایسے جواں سال اور جواں مرگ شاعر کا ہے جو اپنی زندگی کی 24 بہاریں ہی پوری طرح نہ دیکھ پایا تھا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک منجھے ہوئے پختہ کار شاعر کا کلام ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رَچھان داغ لولُک مےٚ گٔے زندگانی

چھُ پیاران بَلہٕ نس یہِ خۄنے جگر میۆن

یہِ غم چون امانتھ رٔچھِتھ چھُس وَچھس منٛز

نٹان واد ڈَلہٕ نس یہِ خۄنے جگر میۆن

☆☆☆

ظٲلم زمانہٕ ییٚلہِ دوہے فریب دِوان گو

ییٚلہِ لۆگ امارَن گنڈتہٕ پیۆ وگولاب وَتن پٹھ

☆☆☆

پننہٕ نوٚ تہٕ پردیو ماؔہرو چھ دِل خستہٕ کوٚرمت میوٚن
تم روزِ آخر دیوٚن مےٚ کیاہ حساب تےٚ حساب تےٚ

☆☆☆

مَتھ اکہِ غأبہٕ یِکھنا سالہِ سونےٚ
ژٕ چھکھنا معرفت کےٚ پیالہِ میوٚنےٚ
یوٚ تامتھ زندگی منٛز شہہ مےٚ روٗزِم
توٚت تامتھ میٛانہِ زیٛوِ پیٛٹھ ناوَ چونےٚ
یِنو ہرگز تہٕ وصلکیٛ واد مُشرَکھ
بہٕ مر یِیلہِ تیٛلہِ تہٕ آسم راگ چونےٚ

علی محمد ماؔہر نے کشمیری میں غزلوں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ ''جگر پارہ'' مجموعے میں شیشہِ دل پھُٹ، شکایتھ، کیاہ ونے، پیتراون، ریہیہ اور ' چھونا بوزان' جیسی نظمیں شاملِ ہیں۔ان منظومات میں سے نموتاً صرف ایک نظم 'شکایتھ' ملاحظہ ہو۔

شکایتھ
وَچھس منٛز لول رچھان
وائےٚ خودایہ!
مےٚ چھُنا کہٕنۍ
بہٕ کیازِ داربَرتھٕ وپرتھ
بہٕ کونہٕ نظر دِوان نٛیبر کُن
مےٚ کیازِ کاژھ گوٚمُت أندری
کہٕنۍ چھُناسہٕ یُس برمژ ربم

بہٕ کیٛاز ِ گٹہِ منٛز
ژٕ گاشرین
مےٚ چھنا آش گاش وُ چھنٛچ
ژےٚ جام ملرن
مےٚ پیالہ خأ لی
بہٕ دامہٕ کرٛ یشان
ژٕ بأ گراں گُتُل گُتُل مَس
مگر رایہِ رائیے
یہِ اَکھ فقط اَکھ
مےٚ چھَم شکایتھ

ماؔہر کے قطعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا کہ یہ کسی ایسے انسان کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہیں جس نے زندگی کے کئی سرد وگرم دیکھے ہوں۔اس اعتبار سے اُن کے معنی آفرین اور سبق آموز قطعات کی اہمیت اور افادیت سے سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا۔

تھاو ہوش شابس حسٕن کام ہیٚز تو
وقت گو سٕبٹھاہ سخ ہے پایس تہِ پیٚز تَو
یہ اصراف کرِ اسہِ خار دوٕہے خار
یہ چھا دین ایمان ہنا توٚہۍ تہِ سٔنز تو

☆☆☆

اکھ تاون اَسہِ أسی چھِنہٕ سوٛنچان
سنہٕ ہو کڈٕ ہو گوڈٕ کتھِ واش

پرانیمژ گتھ سرٕ کھرٕ کرٕ ہو
نوٕ نوٚ وسرٕ ہَو ہِر گرٛشھہِ فاش

جیسا کہ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ پرتھوی ناتھ کول سائلؔ جو خود بھی کشمیری شاعر تھے، نے ماؔہر کے دوسرے شعری مجموعہ ''جگر پارہ'' کی نہ صرف کتابت کی ہے بلکہ ماؔہر کی شاعری سے متعلق کشمیری زبان میں اختصار سے کام لیتے ہوئے مجموعی طور پر وسیع تناظر میں شعر وادب کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، میں نے اُن کا اردو ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے:۔

''یہ حقیقت ہے کہ ایک فن کار کا ایک ایک فن پارہ اُس کا جگر پارہ ہوتا ہے۔ جہاں تک فن کار کے تجربے اور قابلیت کا سوال ہے اُس میں فرق اور تفاوت ہوسکتا ہے۔ اس کے باوصف جگر پارہ جگر پارہ ہے۔ وہ کس طرح اس کی بنیاد رکھتا ہے، آبیاری کرتا ہے اور پچکارتا ہے۔ پھر آذر کی طرح اُسے تراشتا اور گھڑتا ہے۔ یہ جگر پارہ ایک شاعر کی غزل، نظم یا تازہ شعر۔۔ایک ادیب کی تازہ تخلیق، ایک مصوّر کا منہ بولتا عمل اور ایک سنگیت کار کی رسیلی راگنی، شیرین اور دل آویز لے ہوتی ہے۔

یہ'' جگر پارہ'' اُن چاہتوں اور ارمانوں کا ایک صریح اظہار ہے جو ہر مجنوں اور ہر لیلیٰ کا مقدر ہے، جس کی خاطر ہر فرہاد اور ہر شیرین کو قربان ہونا پڑا۔ سقراط نے بھی اپنے دور میں ایسے ہی جگر پارے کے لیے جان کی بازی لگائی۔ اسی درد وغم نے میرابائی، ارنہ مال اور حبہ خاتون کو دل کش سوز وسرود بخشا ہے۔ الغرض اس جگر پارے کو ہر دور میں رنگ و نور کے نت نئے جامے پہنا کر سجانے سنوارنے اور آراستہ و پیراستہ کرنے والے اپنی منشا کے مطابق اسے حسین و جمیل بناتے گئے۔ جہاں کالی داس اور شیکسپیئر

نے اپنے انداز سے اس جگر پارے کو اہمیت اور افادیت بخشی، وہیں لل دید اور نندہ ریشی بھی اپنی طرف سے اسے عرفان کی حقیقت سے آشنا کرنے میں قطعاً پیچھے نہ رہے بلکہ انھوں نے اس کے قیمتی جوہر کو عیاں کیا۔ اگر چہ اقبال اور ٹیگور اس کے فلسفے کی باریکیوں کو آشکار کرنے میں مصروف رہے۔ پرمانند، روسل میر اور مہجور نے اپنی جانب سے اس جگر پارے کو آشکارا کر کے بازار میں لانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ وقت کافی بیت گیا اور نئے بُت تراش، نئے مصنّف، نئے ادیب اور نئے شاعر اس جگر پارے کو نئے طور طریقوں سے دیکھنے بھالنے لگے اور نئے فلسفی اس فلسفے پر نئے انداز سے غور وفکر کرنے لگے۔ شیخ علی محمد ماہرؔ بھی نئی راہوں کا متلاشی ایک راہی ہے۔ یہ بھی لگ بھگ سات برس سے اس راہ پر گامزن ہو کر تگ ودو میں مصروف ہے۔ اسے بچپن سے ہی جگر پارہ نے مہمیز لگائی ہے۔ اُس کے دودھ آشنا دہن میں تب بدمزگی پیدا ہوئی جب وہ باپ کی طرف سے یتیم ہو گیا جس کا نام شیخ غلام محمد تھا۔ ماہرؔ ایک سیدھے سادے گھر کا چشم وچراغ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کے لیے دعا کروں کہ یہ پھولے پھلے اور اس کے جگر پاروں میں رنگ پیدا ہو''

(پرتھوی ناتھ کول سائل، 15 اگست 1977)

کشمیر کے شاعر، ادیب اور صحافی جاوید آذر علی محمد ماہرؔ کے ہم عصر اور ہمدم رہے ہیں۔ وہ اُن دنوں کورٹ روڈ امیرا کدل میں رہتے تھے۔ جب کہ علی محمد ماہر مائسیمہ بازار کے متصل دُبجی کے مکین تھے۔ جاوید آذر کے بقول علی محمد ماہرؔ کا پہلے پہل تخلص قاتلؔ تھا جسے انھوں نے کسی کے مشورے پر بدل کر ماہرؔ رکھا تھا۔

کشمیری زبان کے ثقہ شاعر اور کشمیری تہذیب وثقافت کے ماہر اور علم بردار

ظریف احمد ظریفؔ نے ماہرؔ سے متعلق اپنی یاداشت کے نہاں خانوں میں جھانکتے ہوئے کہا کہ وہ اگر چہ لااُبالی طبیعت کے مالک تھے مگر مجموعی اعتبار سے اُن کی شخصیت بیک وقت کئی اوصاف کی حامل تھی۔ وہ اپنی دوسری سرگرمیوں کے علاوہ اردو اور کشمیری میں شعر کہتے تھے اور میرے پاس محکمۂ اطلاعات کے دفتر واقع جواہر نگر پارک میں اکثر و بیشتر آتے اور مجھے اپنی تخلیقات دکھاتے تھے، جن کی میں نوک پلک سے درست کرتا تھا۔ میں نے اُن کا تخلص قاتلؔ سے بدل کر ماہرؔ کر دیا اور پھر وہ اسی تخلص سے ادبی دنیا میں معروف ہوئے۔

علی محمد ماہرؔ اور اُن کے معاصرین نے شعر، ادب اور فن سے متعلق ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے رائٹرس کلب اور تلاشِ ادب کے نام سے ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا تھا جس کی ہفتہ وار میٹنگیں عموماً پرتاپ پارک میں ہوتی تھیں اور جب کبھی انھیں کوئی جلسہ وغیرہ کرنا ہوتا تھا تو وہ کسی ہال وغیرہ میں منعقد کیا کرتے تھے۔

وادیِ کشمیر کے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے مل بیٹھنے کا ایک اہم ٹھکانا مولانا آزاد روڈ کا کافی ہاوس تھا مگر وہاں عام طور پر سینئر ادبا اور شعرا کا آنا جانا ہوتا تھا۔ اس لیے نوآموز تخلیق کار اس طرف کا رُخ بہت کم کرتے تھے۔

شعر، ادب، موسیقی اور دیگر فنون سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک اور ٹھکانا کوکر بازار میں Polka Restaurant کا قہوہ خانہ بھی تھا جہاں عمر مجید، علی محمد ماہرؔ، جاوید آذرؔ، رفیق رازؔ، فیاض دلبرؔ، امداد ساقیؔ، غلام نبی شاہدؔ، شمس الدّین شمیمؔ، مشتاق مہدیؔ، شکیل الرحمٰن، فاروق آفاقؔ اور ان کے دوسرے ہم عصر شعرا اور ادبا کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

Polka Restaurant کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ یہاں شام

ہوتے ہی اِخراج پورہ جواہرنگر کا رہنے والا ماسٹر اسداللہ نام کا ایک اعمیٰ جو موسیقی کے فن میں کافی مہارت رکھتا تھا، اپنے کسی شاگرد کا ہاتھ تھامے آوارد ہوتا تھا اور اپنی پُرسوز لے میں موسیقی کی محفل کا آغاز قتیل شفائی کی اس مشہور غزل سے کرتا تھا۔

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ
سکوتِ مرگ طاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

یہ محفل رات گئے تک جاری رہتی تھی۔ اس دوران خورد ونوش کے دور بھی چلتے رہتے تھے۔ محفلِ موسیقی کے آخر میں غلام نبی خیالؔ کی کشمیری غزل پیش ہوتی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ضایہِ مَتہٖ کرِتَم ٹاٗٹھ جواٗنی ژٕے ہاچھےٚ میاٗنۍ دِرٕی
دم دار یارو سمسار فاٗنی ژٕے ہاچھےٚ میاٗنۍ دِرٕی

اس کے ساتھ ہی موسیقی کی اس محفل کا اختتام ہوتا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کرتے تھے۔

یہاں Polka Restaurant کا تذکرہ کرنا اس لیے لازمی ہے کہ 12 فروری 1980 کو علی محمد ماہرؔ اپنے مالکِ حقیقی سے ملنے سے قبل اسی ریسٹورنٹ میں اپنے احباب کے ساتھ گپ شپ لگانے اور چائے پینے کی غرض سے ایک میز پر بیٹھے تھے، جہاں جاوید آذرؔ اور اُن کے دوسرے دوست پہلے سے موجود تھے۔

اس ضمن میں جاوید آذر کا کہنا ہے کہ جب چائے آئی تو ماہرؔ اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ چائے پینا شروع کریں میں گھر جا کر ماں سے مل کر آتا ہوں۔ ابھی چائے کے چند گھونٹ ہی پیئے تھے کہ کسی نے آ کر یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ علی محمد ماہرؔ کو بڈشاہ پل کی سڑک پر گاڑی نے ٹکر ماری ہے۔ ہم یک دم اُٹھے اور بڈشاہ پل والی سڑک پر پہنچے جہاں ماہر سڑک پر بُری طرح سے زخمی پڑے ہوئے

تھے۔ہم نے اُنھیں تھری ویلر میں سوار کر کے ہسپتال لے جانے کی کوشش کی مگر جہانگیر چوک پہنچتے ہی اُنھوں نے آخری ہچکی لے کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

علی محمد ماہرؔ کی مقبولیت اور ہر دلعزیز شخصیت کا اندازہ بلا امتیاز مذہب وملت ادبا، شعرا اور اُن عزا داروں سے لگایا جاسکتا ہے جنھوں نے اُن کی تعزیتی مجلس میں شرکت کی تھی۔

علی محمد ماہرؔ کے بارے میں یہ مختصر سا مضمون ضبطِ تحریر میں لانے کا میرا ایک مقصد فقط اُن کی وہ غزلیں ہیں جنھیں شیرازہ "نوجوان نمبر" جلد 18، شمارہ 6 بابت اکتوبر 1979 میں شائع کیا گیا تھا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی صاحبِ علم کے پاس ماہرؔ کے کشمیری زبان میں شائع شدہ کتابچے 'انتظار' اور 'جگر پارہ' کے علاوہ اُن کی کچھ اور تخلیقات موجود ہوں تو وہ اُنھیں کشمیر ویلی تھیٹر کے اربابِ اختیار تک پہنچائیں تاکہ انھیں شائع یا محفوظ کیا جاسکے۔

علی محمد ماہرؔ کے احباب اور شعر وادب کا ذوق رکھنے والوں کی ضیافتِ طبع کے لیے ذیل میں اُن کی دو غزلیں پیش کی جارہی ہیں جنھیں 43 سال سے میں نے حرزِ جاں بنا کر رکھا ہے۔

بکھرا تمام عمر جو آنسو نظر میں تھا
بن کے لہو بہا کہ جو اس چشمِ تر میں تھا
ناگن کے روپ میں وہی اب ڈس گئی مجھے
دُلہن کے روپ میں جسے پالا جگر میں تھا
اب کون راز دان ہے اے وائے مفلسی
وہ مہربان تو چل بسا جو اپنے گھر میں تھا
افسانہ میرے غم کا سکون بخش ہی تو ہے
آنکھوں کے خوابِ نو کا اُجالا نظر میں تھا

امید کی دیوار بھی وہ تھر تھرا گئی
جب ولولہ ہوس کا اگر میں مگر میں تھا
وہ دیدۂ نمناک ہے حیران قفس میں
بے کیف سا لگا وہ اثر جو سحر میں تھا
ماہر ہے دِل کی آگ میں امید کی کرن
کیا ذوقِ دید آج وہ چشم گہر میں تھا

☆☆☆

تعبیر مقرر ہوئی بے تاب سڑک پر
رات کو دیکھا کبھی جو خواب سڑک پر
ہر اک قدم پہ بھوت بنے ہیں یہاں خدا
کہتی رہی یہ رات بھر مہتاب سڑک پر
پُرسان نہیں اس دہر میں یہ دِل کی رہ گزر
سایہ وجود کا بنا سراب سڑک پر
شہرِ جنوں کے شور کو ارزان نہ کر سکے
ہے اس سرائے دہر میں شباب سڑک پر
ملنے کی آس ختم ہوئی آج ہے ولے
چنتا ہوں میں اجڑے ہوئے گلاب سڑک پر
پیری میں ہمیں یاد تیری ساتھ ہی رہی
کب چھوٹ چکا آنکھ سے سیماب سڑک پر
میں کون ہوں ماہرؔ کسے آواز دوں بتا
میں لاش اپنی لے کے ہوں بیتاب سڑک پر

ماہرؔ کی غزلوں کے بعض اشعار کا مطالعہ قاری کو یہ احساس میں دلاتا ہے کہ جیسے وہ اُن کے انتقال کے بعد کہے گئے ہوں، بالخصوص 'سڑک پر' ردیف والی غزل کا یہ مقطع

میں کون ہوں ماہرؔ کسے آواز دوں بتا
میں لاش اپنی لے کے ہوں بیتاب سڑک پر

شیخ علی محمد ماہرؔ کے ساتھ میری شناسائی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اُن کی غزلوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا ایسا والہ وشیدا بنالیا کہ میں اتنے برسوں سے اُنھیں اپنے دل کے قریب محسوس کرتا رہا ہوں اور آج اُن کا کما حقہ مزید اردو اور کشمیری کلام حاصل کر کے اُن کے بارے میں یہ مقالہ سپردِ قلم کیا مگر یہ بات شدت سے محسوس کی کہ اُن کا بہت سارا اردو اور کشمیری کلام دستیاب نہیں ہے۔ اگر علی محمد ماہرؔ کے کشمیری کلام کے کاتب پرتھوی ناتھ کول سائلؔ، جو خود بھی کشمیری زبان کے ایک معتبر شاعر تھے، حیات ہوتے تو اُن سے ماہرؔ کے بارے میں کئی اہم معلومات حاصل ہوتیں۔ ہوسکتا ہے اُن کے پاس ماہرؔ کا کچھ اور غیر مطبوعہ کلام بھی کتابت کے لیے موجود ہو رہا، لیکن دو سال قبل سائلؔ بھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

اس ضمن میں مجھے یہ بات کہنے میں قطعاً باک محسوس نہیں ہوتا کہ ماہرؔ کے انتقال کے بعد اُن کی بیاض یا غیر مطبوعہ شاعری کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے پاس ضرور رہی ہوگی جو وارثوں تک نہیں پہنچی۔ ماہرؔ کے احباب واقارب بشمول ان کے بھائیوں کا کہنا ہے کہ ماہرؔ کے انتقال کے بعد اُن کی بیاض اُنھیں دستیاب نہیں ہوسکی ہے، البتہ اندیشہ ہے کہ حادثے کے وقت کسی نے اُن کی بیاض اُٹھالی ہو یا ماہرؔ نے اپنی حیات میں ہی خود کسی کو دیکھنے یا کتابت کی غرض سے دی ہو اور پھر اس نے نہیں لوٹائی۔ بہرکیف یہ عالم امکان ہے یہاں کچھ بھی بعید از وہم وگماں اور عقل وقیاس ہے۔

ماہرؔ کے خاص الخاص دوست جاوید آذرؔ نے اُن کے انتقال پر درج ذیل دو قطعات کہے ہیں جو میں اُن کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی نذر کرتا ہوں:

شعر وسخن سے جی یہاں کیا اوب گیا
مڑ کے بھی دیکھا نہیں کیا خوب گیا
مطلعِ ادب پہ اک نو خیز ستارہ
اُبھرا بھی نہیں تھا ابھی کہ ڈوب گیا

☆☆☆

محوِ گریہ یہ چار سو دیکھا
غم زدہ تو کاخ و کو دیکھا
چہرہ چہرہ سیاہ بادل تھا
جب بھی ماہرؔ کو سرخرو دیکھا

1400 ہجری

علی محمد ماہرؔ جیسے اُبھرتے ہوئے ہمہ جہت اور ہمہ رنگ نوجوان فن کار کے انتقالِ پُر ملال پر جو مختلف تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے اس سلسلے میں مجھے ماہرؔ کے برادر اصغر پیر مشتاق احمد نے وٹس ایپ پر 43 سال قبل کے اخباروں جو تراشے بھیجے ہیں اُن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست کی مختلف ادبی انجمنوں، اداروں بشمول جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز وڈیلی ویجز ایمپلائز، کشمیر ویلی تھیٹر، سرینگر رائٹرز کلب، ینگ ڈراماٹسٹ سوسائٹی، آزاد کلچرل تھیٹر، کشمیر رائٹرز گلڈ، کشیر گلشنِ ادب بڈگام اور کشمیر کلچرل سوسائٹی بٹہ مالو وغیرہ نے ماتمی اجلاس منعقد کئے۔

اخبارات کے تراشوں کے مطابق ماہرؔ کے سوگواروں میں جاوید آذرؔ، عمر

مجید، م۔م صدیق، ایس ایم قمر، شمس الدین شمیم، فاروق آفاق، عبدالرشید فراق، طاہر رحمٰن، مکھن لال بٹ، پرواز خورشید اور پرویز قریشی کے اسمائے گرامی زیادہ نمایاں ہیں۔ بہرکیف میں علی محمد ماہر سے متعلق اپنی بات مرزا غالب کے اس مصرع پر ختم کرتا ہوں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

غزلیات

☆.....ڈاکٹر رؤف خیؔر

بہت دنوں میں یہ عقدہ کھلا ،مخالف ہے
جسے میں دوست سمجھتا رہا، مخالف ہے

بُرا نہ چاہا نہ احسان ہی کیا اُس پر
تو پھر وہ کس لیے آخر مرا مخالف ہے

میں منزلوں کے لیے، منزلیں ہیں میرے لیے
مری بلا سے جو ساری فضا مخالف ہے

جو حوصلہ ہے تو کھُل کر وہ سامنے آئے
پتہ چلے کہ موافق ہے یا مخالف ہے

نہیں ہوں میں جو کسی سلسلے سے وابستہ
اسی خیال سے ہر سلسلہ مخالف ہے

مرے لیے تو ہے دشمن بہ درجہء اولیٰ
وہ نا بکار اگر آپ کا مخالف ہے

رؤف خیؔر اب اندھیرا اور کیا ہوگا
ہَوا تو خیر ہَوا ہے ،دِیا مخالف ہے

☆☆☆

اُن کا دہن ہے یا کوئی مطلع غزل کا ہے
لب بند ہیں کہ مصرع پہ مصرع غزل کا ہے

ماتھے پہ اُن کے دستِ مرصع غزل کا ہے
اعضائے خوش بدن ہیں کہ مجمع غزل کا ہے

ابرو ہے یا دھنک کے مقابل کوئی دھنک
دیدہ وروں کے حق میں مرقع غزل کا ہے

اُس کم سخن پہ بار نہ ہو حرفِ آرزو
اظہارِ مدّعا پہ ملمع غزل کا ہے

وہ حسنِ بے پناہ اب آیا ہے بام پر
سچ پوچھئے تو خیؔر یہ موقع غزل کا ہے

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر رؤف خیرؔ

آزمائش میں سبک دوش نہ شانے نکلے
ہم سراسر ترا احسان اٹھانے نکلے
پاؤں شل ہو گئے، بینائی نے جی چھوڑ دیا
تیرے کوچے سے کہیں اور جو جانے نکلے
استخارے میں لگے رہ گئے اربابِ خرد
تیری راہوں میں جو نکلے تو دِوانے نکلے
دشت ہی دشت ہے، ویرانی ہی ویرانی ہے
خاک زادے جو کہیں خاک اڑانے نکلے
ہم نے دیکھے تو ہیں ہاتھوں میں اُسی کے پتھر
جس کی راہوں میں ہم آئینے سجانے نکلے
بے ٹھکانوں نے ٹھکانا بھی دلوں میں ڈھونڈا
خیرؔ صد شکر ٹھکانے کے ٹھکانے نکلے

☆☆☆

نہیں بوتا کہ جس تِس کو کروں خوش
مرے مولا میں کس کس کو کروں خوش
قصیدہ شاہ کا لکھنا نہ آیا
نہ صورت ہے کہ مفلس کو کروں خوش
مجھے یہ کام آتا ہی نہیں ہے
برابر رطب و یابس کو کروں خوش
وہی ہوتا ہے دشمن جان و دل کا
میں دے کر جان بھی جس کو کروں خوش
وہ ٹس سے مس کبھی ہوتا نہیں ہے
میں آخر کیسے بے حس کو کروں خوش
کبھی دیدہ وری کی داد پاؤں
کہیں تو چشمِ نرگس کو کروں خوش
کہاں تک خیرؔ یہ ذمہ اٹھاؤں
کبھی مسٹر کبھی مِس کو کروں خوش

☆☆☆

☆.....پروفیسر حیات عامر حسینی

ایک رمزِ آسمانی دیدنی ایک نقشِ کہکشانی دیدنی
ایک سایہ سازشوں کا الاماں ایک دشتِ زرفشانی دیدنی
ایک لمحہ خواب کا گزرا ہوا ایک رقصِ بے بیانی دیدنی
ایک دشتِ العطش کرب و بلا ایک ضربِ ناگہانی دیدنی
ایک رقصِ مہ و شان و خار و گل ایک طربِ لن ترانی دیدنی
ایک نقطہ آسماں کے درمیاں ایک فصلِ بدگمانی دیدنی
کھیل یہ آدھا ادھورا دیکھنا اور یہ جوئے زمانی دیدنی
پھر اچانک جَل اُٹھے سارے چراغ پھر ہوئی ساکت کہانی دیدنی
پھر ہوئی آشفتہ مو بزمِ چمن پھر ہوئی آتش بیانی دیدنی
لمحہ لمحہ دل ہوا دشت ِشرر لمحہ لمحہ مہربانی دیدنی
پھر اٹھا آنکھوں میں اِک گردِ ملال پھر ہوا نقشِ روانی دیدنی
پھر ہوا سایہ فگن اِک نقشِ جاں پھر ہوئی دل کی کہانی دیدنی
پھر اچانک بُجھ گئے سارے چراغ
پھر ہوا رقصِ شبانی دیدنی

☆☆☆

☆.....پروفیسر حیات عامر حسینی

فسونِ دلبراں کی بات کرلیں　　فریبِ مہ وشاں کی بات کرلیں
نوائے خوش بیاں کی بات کرلیں　　صدائے گل فشاں کی بات کرلیں
کسی شیریں زباں کی بات کرلیں　　ردائے جسم و جاں کی بات کرلیں
چلو چھیڑیں فسونِ عارفانہ　　چلو وہم و گماں کی بات کرلیں
عیاں ہے دانش و بینش یہاں پر　　چلو رقصِ زماں کی بات کرلیں
تکلم ہے کسی کا ساحرانہ　　کسی عاجز بیاں کی بات کرلیں

خوشا آیا وہ کافر وقتِ آخر
فسونِ گل رخاں کی بات کرلیں

☆☆☆

☆.....محمد اطہر

تمام رستے کھلے ایک دوسرے کے لئے
خوشی کی بات ہے یہ سارے قافلے کے لئے
کسی کے واسطے خود کو بدل نہیں سکتے
ہوئے ہیں رابطے کمزور ضابطے کے لئے
حضور! چاہئے اِس حُسنِ انتخاب کی داد
میں اُس سے ہار گیا، اُس کو جیتنے کے لئے
ترے بغیر، مرے پاس کچھ نہیں، جیسے
مرے بغیر، ترے پاس سوچنے کے لئے
تمام بات تو بین السّطور آنا تھی
تمام بات کو رکھا ہے حاشیے کے لئے
جلائے جانے پہ احساس ہوگیا ہم کو
کہ شہرِ دل کو بچایا تھا حادثے کے لئے

☆☆☆

سادگی اختیار کرتے ہوئے
رہ گئے انتظار کرتے ہوئے
بندگی ساری ہوگئی یک جا
تجھ کو پروردگار کرتے ہوئے
جان میں جان آگئی جیسے
جان پر، جاں نثار کرتے ہوئے
ذکرِ شمس و قمر ہی بھول گئے
فکرِ لیل و نہار کرتے ہوئے
حوصلے کو بنائے رکھنا ہے
اِس خزاں کو بہار کرتے ہوئے

☆☆☆

☆.....محمد اطہر

ہنوز جذبِ محبت ترا بحال نہیں
وگرنہ مل کے بچھڑنا کوئی سوال نہیں
ترے تو ظاہری کوئی بھی خدّوخال نہیں
تجھے خیال میں لانا مری مجال نہیں
ہر ایک سمت میں مجنوں کو نجد قبلہ ہے
جنوب و مشرق و مغرب نہیں، شمال نہیں
اسی لئے تو تمہاری مثال قائم ہے
تمہاری طرح کوئی اور بے مثال نہیں
بچھڑ کے ملنا ہر انساں کے بس کی بات نہیں
بچھڑنا، مل کے تو کوئی بڑا کمال نہیں

☆☆☆

الف کا اور با کا مسئلہ ہے
یا پھر اس سے سوا کا مسئلہ ہے
جزا کا اور سزا کا مسئلہ ہے
عبادت میں رِیا کا مسئلہ ہے
سمجھنا ہے دوائے دردِ دِل کو
دلِ ناداں! شِفا کا مسئلہ ہے
حُسینؓ ابنِ علیؓ کی شان دیکھو
اگر صبر و رضا کا مسئلہ ہے
یہ تو بس سانس لینا پڑ رہی ہے
یہ تو خالص بقا کا مسئلہ ہے
دِیا دہلیز پر رکھنا ہے روشن
مگر چلتی ہوا کا مسئلہ ہے

☆☆☆

☆......آصف عطاؔاللہ

بھلا یہ کیسے ہے ممکن کہ بدمزہ نہ لگے
تجھے برا بھی لگوں اور مجھے بُرا نہ لگے
خدا کرے کہ کسی کی نظر لگے نہ تمہیں
اگر لگے تو کسی کی مرے سوا نہ لگے
عجیب دنیا ہے صاحب جہاں سبھی انساں
ہیں ایک جیسے مگر کوئی ایک سا نہ لگے
تمہارا عشق میں نقصان کچھ نہیں ہوگا
وہ ایک شخص تمہیں جب تلک خدا نہ لگے
سنو، یہ بات کسی معجزے سے کم تو نہیں
تمہارے چھوڑے ہوؤں کو جو آب و دانہ لگے

☆☆☆

رہے زیرِ خوف و خطر زندگی بھر
نہ ڈھونڈا کوئی چارہ گر زندگی بھر
چھوا تک نہیں تیرے اس خط کو میں نے
سنبھالے رکھا طاق پر زندگی بھر
بس اک بار شرما کے دیکھا تھا اس نے
مؤثر رہی اک نظر زندگی بھر
تمنا میں مرنے کی گن گن کٹے ہیں
یہ لمحے، یہ شام و سحر زندگی بھر
محبت کہیں سے نہ پائی عطاؔ نے
بھٹکتا رہا در بہ در زندگی بھر

☆☆☆

☆......آصف عطا اللہ

مسافر تیری قسمت میں تو گھر رکھا ہوا ہے
تو پھر کس شئے نے تجھ کو در بہ در رکھا ہوا ہے
جلا دیتی وگرنہ ربط کو حسرت کی گرمی
یہ برتن ہم نے دھیمی آنچ پر رکھا ہوا ہے
بھلا کیسے تھا ممکن وہ مجھے رکھ لیتا دل میں؟
میرے جیسوں کو اس نے کام پر رکھا ہوا ہے
وگرنہ جسم کی مٹی کھسک جاتی کسی دن
میرے اندر کہیں پر اک شجر رکھا ہوا ہے

☆☆☆

جنونِ شوق میں میں نے تمہارا نام لیا
پھر اس کا مجھ سے زمانے نے انتقام لیا
کھلی جو آنکھ تو پہلے پہل تجھے دیکھا
زباں نے بولنا سیکھا تو تیرا نام لیا
کسی نے پیش کیا دل، کسی نے دل رکھا
کسی نے ہاتھ بڑھایا، کسی نے تھام لیا

☆☆☆

☆.....عمؔر فیاض

میری آواز کون سنتا دوست
میرے چاروں طرف خلا تھا دوست
ایک دن چاک لے اڑوں گا ترا
اور بناؤں گا آپ اپنا دوست
ایک سیّارے پر ہیں میرے لوگ
ایک سیّارے پر میں تنہا دوست
وہ،جو "تنہائیاں" بناتا تھا
ایک دن بن گیا ہمارا دوست
شام ہوتی ہے اور کھلتا ہے
دل میں وحشت کا کارخانہ دوست

☆☆☆

ہمیں ہماری عبادت کا کچھ صلہ تو ملے
بھلے وہ شخص نہیں،کوئی دوسرا تو ملے
اِسی مقام پہ بچھڑے تھے ایک دوجے سے
اِسی مقام پہ مانگی گئی دعا تو ملے
کوئی گلہ ہی نہیں اُن سے جو کبھی نہ ملے
مگر وہ لوگ کہ جو ایک مرتبہ تو ملے
جو لوگ مجھ کو حقیقت میں مل نہیں پائے
میں جب خیال کی وادی میں جا بسا تو ملے

☆☆☆

☆.....عمؔر فیاض

جب تلک تم کو نہیں دیکھیں گے
ہم ترے در سے نہیں اٹھنے کے
وہ ترے بعد بہت روتے ہیں
جو ترے ساتھ بہت ہنستے تھے
گھر تو آباد نہیں کر پائے
دشت آباد کیا ہے ہم نے
وہ جنہیں دل میں نہیں رہنے دیا
ان کو خوش فہمی میں رہنے دے
جب کوئی شانہ میسر نہ ہوا
تیری دیوار سے لگ کر روئے

☆☆☆

جو کبھی ڈھونڈنے نکلا تھا محبت میں سکوں
اب وہی شخص بھٹکتا ہے سرِ دشتِ جنوں
میں ترا وصل مناؤں کہ ترا ہجر سہوں
میں بیک وقت ترے پاس بھی ہوں دور بھی ہوں
گھر سے اک بات تجھے کہنے کو نکلا تھا میں
اور اب سوچ رہا ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں
کاش تو روز پلٹ آنے میں تاخیر کرے
اور میں روز اسی طرح تری راہ تکوں

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر یونس ڈار

آخرش خوابِ پریشاں کو کہاں تک دیکھوں
ہر طرف رات کا سایہ ہے جہاں تک دیکھوں
اب تو عادت ہے سرِ شام بکھر جانے کی
ٹوٹ جانا تو مقدر ہے یہاں تک دیکھوں
ہے ترے شہر میں زخموں کی نمائش کا رواج
پھر ترا شوق لبِ زخمِ گماں تک دیکھوں
ان پرندوں کو بھی ہجرت کا مزہ کیا معلوم
ان کی پرواز کو میں اپنے مکاں تک دیکھوں
درد کے ہاتھ میسر ہوئے اب کے کس کو
کس کی رنجش کو نشاں سے میں کماں تک دیکھوں
حوصلہ ہے تو فقط شوقِ نظارہ کرلوں
ورنہ دیوانے کا غم ہے کہ گماں تک دیکھوں

☆☆☆

شب پرستوں سے اندھیروں کا سفر کیا پوچھوں
لُٹ گئے دن کے مکیں، شام نگر کیا پوچھوں
جن کی نسلیں ہی سرِ عام نشے میں دُھت ہوں
اُن بزرگوں سے کبھی ان کے ہنر کیا پوچھوں
مدتوں پیٹ نہ بھر پایا مری یادوں کا
قرض کے چار نوالوں پہ گزر کیا پوچھوں
اور حاصل ہوئی جاتی ہے شبِ غم خفت
چند ساعت کے چراغوں کی سحر کیا پوچھوں
دردِ تنہائی کی صحبت کا یہ انتم غم ہے
اس یتیمی کا دلِ زار میں گھر کیا پوچھوں

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر یونس ڈار

پھر چناروں کو کھا گیا موسم
پھر دلوں کو جلا گیا موسم
صبر آئے گا پھر نگاہوں کو
درد کو بھی رُلا گیا موسم
ایک بھی غم مرا نہیں اچھا
پھر یہ کیا کیا دِکھا گیا موسم
پھر سے اُترا وہ خواب کے رستے
پھر سے نیندیں اُڑا گیا موسم
غم ٹپکتا ہے یاد کی چھت سے
بارشوں میں نہا گیا موسم
تم نے آنے میں دیر کی ورنہ
میرے حق میں لکھا گیا موسم

☆☆☆

درد بن کر سدا رہا مجھ میں
چپہ چپہ خفا رہا مجھ میں
دو گھڑی کی یہی کہانی ہے
زرد سایا، ہرا رہا مجھ میں
آرزو کے یتیم خانے کا
ہر ستم ہی نیا رہا مجھ میں
غم زیارت کو روز آتے ہیں
مقبرہ یاد کا رہا مجھ میں
روشنی میں مزید وسعت تھی
کیوں اندھیرا پڑا رہا مجھ میں

☆☆☆

☆.....منتظر رسول

خود سے ہی بیزار ہوں میں آج کل
کس قدر بیکار ہوں میں آج کل

اُس گلی سے رابطہ کیا ہوگیا
ہر گلی پر بار ہوں میں آج کل

محو ہے دنیا نہ جانے کس طرف
قابلِ دیدار ہوں میں آج کل

دورِ جدت کھا گیا رتبہ میرا
مانندِ اخبار ہوں میں آج کل

دکھ مرا ہے ان سبھی سے مختلف
پھول ہوکر خار ہوں میں آج کل

جس نگرسے ہار کر لوٹا تھا تو
اس نگر کے پار ہوں میں آج کل

حال یہ ہے خود پہ بھی قابو نہیں
نام کا سردار ہوں میں آج کل

☆☆☆

غم خوار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو
ہر یار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو

توہین ہے تمہاری اے میرے چارہ گر
بیمار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو

ہر روز در بدلنا تم ہی کو آتا ہے
خود دار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو

دشمن تو کہہ رہا ہے تری عمر ہو دراز
پر یار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو

کر کے تباہ خود کو بے مول منتظر
لاچار کہہ رہا ہے بہتر ہے موت ہو

☆☆☆

☆.....منتظرؔ رسول

تمسخر یوں اُڑایا جا رہا ہے
اسے میرا بتایا جا رہا ہے
اُسے میرا بتا کر یار تم کو
سبق الٹا پڑھایا جا رہا ہے
دلا کے یاد تیری مجھے کو پل پل
جگر میرا جلایا جا رہا ہے
لگا کر آگ میرے آشیاں میں
نیا اک گھر بسایا جا رہا ہے
وہ جو لڑکا تھا تیری چاہ جاناں
اسے پاگل بلایا جا رہا ہے
لگا کر میری میت کو ٹھکانے
اُسے دیکھو سجایا جا رہا ہے

☆☆☆

مہک گلوں سے جو آ رہی ہے
یہ یاد تیری دلا رہی ہے
کسی قلندر کی چاہ ہو تم
یہ چشمِ نرگس بتا رہی ہے
نہ ہونے دیتی ہے وہ کسی کا
نہ مجھ کو اپنا بنا رہی ہے
میں کیسے کہہ دو کہ تھک چکا ہوں
وہ سانولی جب بلا رہی ہے
وہ منتظرؔ ہے فقط ندامت
جسے تو اپنا بتا رہی ہے

☆☆☆

☆.....وقار دانش

گلشن پہ مہربان یہ موسم نہیں ہوا
پھولوں کے ساتھ جو ہوا کچھ کم نہیں ہوا
موجود ہی نہیں ہے دل سینے میں اس لئے
بربادیٔ چمن سے کوئی غم نہیں ہوا
لاکر حصارِ ذات میں قیدی بنا دیا
خلدِ بریں میں مطمئن آدم نہیں ہوا
فطرت کے اصولوں سے وہ مجبور تھا شاید
جو آشنا تو تھا مگر محرم نہیں ہوا
دانش عجیب اس کا ہے اندازِ گفتگو
میں ہی رہا وہ ساری عمر ہم نہیں ہوا

☆☆☆

اپنے ہی دشمن تھے ہم اغیار سے ڈرتے رہے
زندگی بھر کاغذی تلوار سے ڈرتے رہے
اُن کی برسی پر بھی ہو اک مرثیہ نذرِ سماع
عمر بھر جو عشق کے اظہار سے ڈرتے رہے
کون سمجھا ہے تری آنکھوں کی بے باکی یہاں
ہم ترے لہجے، ترے گفتار سے ڈرتے رہے
ایسے بھی کچھ تجربے تھے عہدِ ماضی میں کہ ہم
دوپہر میں شاخِ سایہ دار سے ڈرتے رہے

☆☆☆

☆.....وقار دانش

اک مجسمہ ہوں میں پتھر کا، جگر پتھر کا ہے
اہلِ مقتل کو بتا دو میرا سر پتھر کا ہے
ہائے میرے قافلے والو، تمہاری خیر ہو
کانچ کا رختِ سفر ہے اور سفر پتھر کا ہے
ہم تو پتھر کے زمانے سے نکل کر آ گئے
کچھ دلوں پر اب تلک لیکن اثر پتھر کا ہے
کس لیے چیخوں یہاں کس کے لیے نوحہ کروں
جب مجھے معلوم ہے سب کا جگر پتھر کا ہے

☆☆☆

کس گماں میں تھے تقاضا روز و شب کرتے رہے
ہم گلے شکوے کسی سے بے سبب کرتے رہے
اس کا ہونا معجزے سے کم نہیں ہے اور ہم
بے وجہ اس سے محبت کی طلب کرتے رہے
کس کے دل میں کیا ہے، کوئی جانے کیا اس بات کو
ویسے کہنے کو محبت ہم سے سب کرتے رہے
زیرِ خنجر اپنا سر پایا تو یہ جانا کہ ہم
ہاتھ کس کا چومتے، کس کا ادب کرتے رہے
یوں تو اپنی تاک میں دانش تھے دیواروں کے کان
گفتگو ہم بھی کسی سے زیرِ لب کرتے رہے

☆☆☆

میرا تخلیقی سفر

☆.....مشتاق احمد وانی

زندگی کے کئی رنگ ہوتے ہیں!!

جہاں تک میری ادبی زندگی کا تعلق ہے مجھے اُردو کے ساتھ چھوٹی ہی عمر سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ شمیم کرہانی، اسمٰعیل میرٹھی، حفیظ جالندھری، مائل خیر آبادی، علامہ اقبالؔ کی مشہور نظمیں خاص کر ''ایک مکڑا اور مکھی'' ''بزمِ انجم'' اور ''ایک آرزو'' مجھے زبانی یاد تھیں۔ برج نارائن چکبستؔ کی مشہور نظم ''رام چندر جی بن باس جاتے وقت'' بھی مجھے ازبر تھی۔ میر تقی میرؔ، غالبؔ، جوشؔ، حسرتؔ، حالیؔ، محمد حُسین آزادؔ، فراق گورکھپوری، رواں اُنّاوی، سیمابؔ اکبر آبادی، تلوک چند محروم، فیض احمد فیضؔ اور جگن ناتھ آزادؔ کے کئی اشعار مجھے آج بھی یاد ہیں۔ شعر و شاعری، ناول، ڈراما اور افسانہ میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ میری پہلی ادبی تخلیق ''احساسِ خطا'' کے نام سے 1988ء میں ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' (دہلی) میں شائع ہوئی۔ پہلی بار ایک رسالے میں اپنی تحریر شائع دیکھ کر مجھے انتہائی مسّرت ہوئی تھی۔ ''احساس خطا'' کہانی نہیں تھی بلکہ میں نے اپنے ایک گناہ کا اعتراف کیا تھا۔ مجھ سے یہ گناہ کچھ اس طرح سرزد ہوا تھا کہ ہمارے پچھلے گھر (مرمت، ضلع ڈوڈہ) میں مُرغی اپنے دس بچّوں کے ساتھ کُٹ کُٹ کرتی آنگن میں گھوم رہی تھی اور اُس کے بچّے اب تقریباً بڑے ہو رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک بلّا جو ہمارے اپنے ہی گھر کا تھا کہیں سے آنکلا اور ایک چوزے پہ جھپٹ پڑا۔ وہ اُسے گردن سے پکڑ کر لے بھاگا۔ میں نے بلّے کا پیچھا کیا اور کچھ ہی

دُوری پر اُس کے منہ سے مرغی کا بچّہ گر گیا لیکن وہ مر چکا تھا۔ بلّا فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ میرے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، میں آہستہ سے درخت پر چڑھا اور زور سے بلّے کی کمر پر ڈنڈا مارا۔ اُس کی کمر ٹوٹ گئی اور ایک دلدوز چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی۔ وہ چلنے سے معذور ہو گیا۔ میں نے اُسے ہاتھوں پہ اُٹھایا اور گھر میں لا کر ایک تاریک سی کوٹھری میں رکھ دیا۔ اب میں نے اُسے دُودھ میں روٹی بھگو کر کھلانے کی کوشش کی لیکن درد کے مارے اُس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ وہ آدھی رات تک کراہتا رہا اور سویرے جب میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ مر چکا تھا۔ میں اُسے مُردہ پا کر بہت دُکھی ہوا۔ میں نے کدال لے کر اُسے کھیت میں ایک جگہ گاڑھ دیا! اسی واقعے کو میں نے بعد میں ''احساسِ خطا'' کا عنوان دیا۔

میری پہلی باضابطہ کہانی ''ٹرپتے پنچھی'' کے نام سے 1989ء میں چھپی تھی۔ یہ کہانی بھی ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' (دہلی) میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ میں نے افسانے لکھنے سے پہلے شاعری کی ہے۔ 1987ء میں جب میں اپنے آبائی گاؤں کے گورنمنٹ مڈل اسکول بہوتہ میں تعینات کیا گیا تو میں نے بچّوں کے لیے ایک دُعا لکھی تھی جسے وہ صبح کی محفل میں گایا کرتے تھے اور آج بھی ہائر اسکنڈری اسکول گوہا میں یہ گائی جاتی ہے۔ اس دُعا کا پہلا شعر آج بھی مجھے یاد ہے:

اے دو جہاں کے مالک کر نظرِ کرم تیرے سوا کوئی بھی ہمارا نہیں
ہے گرداب میں سفینہ یہ ڈوب نہ جائے نظر آتا کوئی بھی کنارا نہیں

میں نے اس کی طرز بھی خود تیار کی تھی اور بڑے پُرسوز انداز میں بچّے اسے اسکولوں میں گایا کرتے تھے۔ میں نے پہلی بے وزن غزل 1983ء میں کہی کہ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ میں بی اے پارٹ فسٹ میں پڑھتا تھا لیکن اُس کے بعد جب میں نے ناگپور کے ایک ماہر عروض دوست جناب خلیل انجم سے اصلاح لینا شروع کیا تو کچھ اچھی باوزن غزلیں بھی کہیں۔ علاوہ ازیں کہنہ مشق شاعروں کا

کلام پڑھنے اور مشقِ سُخن کرنے کے بعد مجھ میں شعر کہنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ میں نے جناب عرشؔ صہبائی سے بھی اصلاح لی ہے۔ شاعری میں اُنھیں اپنا اُستاد مانتا ہوں۔ میں نہ عروض جانتا ہوں اور نہ ہی سُخن شناس ہوں، البتہ شعر کو جب میں اپنے مخصوص انداز میں پڑھتا ہوں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا شعر وزن میں ہے اور کون سا بے وزن۔ مزید برآں شاعری صرف ردیف وقافیہ جوڑنے کا نام نہیں ہے۔ شاعری نازک ترین فن ہے۔ میں نے جب اپنے اندرون میں جھانکا تو مجھے اپنی طبیعت شعر کہنے کے لیے غیر موزوں معلوم ہوئی۔ تقریباً آج تک کُل بیس پچیس غزلیں کہی ہیں۔ اُنھیں اپنی بیاض میں محفوظ رکھا تھا لیکن میری وہ بیاض کوئی چُرا کے لے گیا ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ کہانی کا خمیر میری رگ رگ میں رچ بس چکا ہے۔ 1988ء میں جب میں اور میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد وانی پانی میں تیرتے ہوئے گرداب میں پھنس گئے تھے تو میں نے اُسی جان لیوا واقعے کو ''موت کا جھٹکا'' نام دے کر ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' میں چھپنے کے لیے بھیج دیا اور وہ اُس میں چھپ گیا۔ میرے افسانے زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ سماجی بُرائیوں پر گہرا طنز کرنے کے ساتھ ساتھ آفاقی قدروں کی بحالی اور بقا پر زور دیتا ہوں۔ زندگی میں خوشگوار ماحول اور اعتدال وتوازن ہنستے ہنستے قائم نہیں ہوتا، اس کے لیے برسوں کی محنت وریاضت درکار ہوتی ہے۔ میں کہانی کے تمام فنی لوازمات کا خیال رکھتا ہوں اور کہانی یا افسانہ تخلیق کرنے کے دوران میری یہ کوشش رہتی ہے کہ میرا قاری میرا مونس وغم خوار بن جائے۔ وحدت تاثر کو میں کہانی کی جان سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میرے افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے میں نے ہر ممکن نئے موضوعات کو اپنایا ہے۔ گھسے پٹے موضوعات پر میں افسانے نہیں لکھتا۔ زندگی کے کئی رنگ ہیں، ہر رنگ کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ میں نئے موضوعات کی تلاش میں رہتا ہوں اور تب تک کوئی

بھی افسانہ نہیں لکھتا جب تک میں شدید تخلیقی کرب میں مُبتلا نہ ہو جاؤں۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو تھوڑا تھوڑا لکھتا ہوں۔ اُسے بار بار پڑھتا ہوں اور زبان و بیان پہ غور و فکر کرتا چلا جاتا ہوں۔ کس لفظ اور واقعے سے قاری پر کیا اثر پڑے گا؟ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں رہتی ہیں۔

2001ء میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ہزاروں غم'' منظر عام پر آیا۔ اس میں کُل سولہ افسانے شامل ہیں۔ بہ فضل اللہ میری اُمید سے زیادہ ادبی حلقوں میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میرے دوست جناب امین بنجارا کا لکھا ہوا دیباچہ اس میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں میں مجھے جو کہانیاں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ ہیں ''اجنبی دودل'' ''تنہا پرندہ'' میں تجھے آواز دیتا ہوں'' ''مکّار'' ''شفاخانہ'' اور ''ہزاروں غم''۔ میرے نزدیک کہانی میں کہانی پن نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ ''ہزاروں غم'' کی کہانیاں زیادہ تر ماہنامہ ''بیسویں صدی'' گلابی کرن'' (دہلی) اور ماہنامہ ''پروازِ ادب'' (پٹیالہ) جیسے ادبی رسائل میں چھپی ہیں۔

2002ء میں میرا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کیا۔ اس ادارے نے میرے اس مقالے کے دو ایڈیشن شائع کر دیئے ہیں۔ میں اس معاملے میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مالی تعاون کے میری یہ کتاب مفت میں چھپ گئی اور مجھے رائلٹی کے طور پر کتابیں بھی دستیاب ہوئیں۔ مزید برآں اس کتاب کی اشاعت سے پوری اُردو دُنیا میں میری شناخت بنی۔ 452 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اُردو کے دیدہ ور ناقدین، محققین اور مفکّرین نے لفظ لفظ پڑھی اور مجھے اپنا لہو نچوڑنے پر مبارک باد دی۔ مذکورہ کتاب نہ صرف برصغیر ہندوستان و پاکستان بلکہ ناروے، امریکہ، جرمنی

اور کنیڈا میں بھی مقبول ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔
2004ء میں میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین پہ مشتمل کتاب ''آئینہ در آئینہ'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے بڑی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کی۔ مذکورہ کتاب میں شامل میرے وہ مضامین ہیں جو میں نے جموں یونیورسٹی میں منعقدہ سیمیناروں میں پڑھے ہیں یا کسی رسالے کے مدیر کی فرمائش پر لکھے ہیں۔

2008ء میں میرے افسانوں کا دُوسرا مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے نام سے شائع ہوا جس میں میرے کُل بارہ افسانے شامل ہیں۔ میرا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ میرے پہلے افسانوی مجموعے ''ہزاروں غم'' سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افسانے کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے اُردو کے اہم اور موقر رسائل میں شائع ہوئے جن میں ماہنامہ ''شاعر'' (ممبئی) ماہنامہ ''شاندار'' (اعظم گڑھ) ماہنامہ ''بیباک'' (مہاراشٹر) بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ سے شائع ہونے والا دوماہی ''پروازِ ادب'' اور اُڑیسہ سے شائع ہونے والا سہ ماہی ''روزن'' اہم ہیں۔ کتابی صورت میں منظر عام پر آنے سے پہلے میں نے یہ چاہا کہ اُردو فکشن کے اہم ناقدین کی نظروں سے یہ افسانے گزریں۔ چنانچہ میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پرفیسر ظہورالدّین، پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، انیس امروہوی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، محمد شاہد پٹھان اور ڈاکٹر محمد ریاض احمد کو مسوّدہ پیش کیا۔ ان تمام صاحب بصیرت افراد نے میرے افسانوں کا موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے جائزہ لیا اور اپنے اپنے تاثرات مجھے لکھ بھیجے۔ اُردو کی ہمہ جہت شخصیت جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے ''میٹھا زہر'' پر ایک جامع اور فکر انگیز مضمون بعنوان ''مُشتاق احمد وانی کے افسانوں کا سچ'' لکھا۔

1999ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے فوراً بعد مجھ میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں ڈی لٹ کروں۔ اُس وقت پروفیسر ظہورالدّین صاحب (مرحوم) جموں یونیورسٹی میں رجسٹرار کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ میں نے اُن سے مشورہ کیا کہ میں ڈی لٹ کرنا چاہتا ہوں اور میری دلچسپی اُردو ادب کی خواتین قلمکاروں سے ہے تو ظہور صاحب نے مجھے ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کے موضوع پر ڈی لٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اُنھوں نے مجھے فیس، فارم اور مذکورہ موضوع کا خاکہ (Synopsis) تمام ضروری لوازمات کے ساتھ ریسرچ سیکشن میں جمع کرانے کو کہا۔ چنانچہ میں نے تقریباً دو ہزار روپیہ فیس، فارم اور اکیس کاپیاں اپنے تفصیلی خاکے کی جمع کرائیں۔ کئی بار مختلف مسائل پر جنرل باڈی کی میٹنگیں ہوتی رہیں لیکن میری ڈی لٹ کی میٹنگ کو ہر بار چند اشخاص کی بے توجہی نے نہیں ہونے دیا اور میری تمام محنت اور وقت یعنی تقریباً آٹھ سال میری زندگی کے ضائع ہو گئے۔ البتہ میں ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کے موضوع سے متعلق مواد اکٹھا کرتا رہا۔ بالآخر جب میں نے کوئی تین سال کے بعد اپنی فیس واپسی کا فارم بھرا تو مجھے کُل نو سو روپے واپس ملے۔ باقی پتا نہیں کہاں گئے! جموں یونیورسٹی میں ڈی لٹ نہیں ہوتی ہے۔ میں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے 2004ء میں بیرونِ ریاست یونیورسٹیوں میں ڈی لٹ کروانے کا پتا لگوایا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی چند یونیورسٹیوں میں ڈی لٹ ایک ضابطے کے تحت ہوتی ہے اور اُن یونیورسٹیوں میں ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی بھی شامل ہے۔ میں نے 2004ء میں ڈی لٹ کا فارم، فیس اور دیگر ضروری شرائط کے علاوہ اپنے موضوع کا تفصیلی خاکہ مذکورہ یونیورسٹی میں جمع کرایا۔ 7، اپریل 2007ء کو مجھے ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں بلایا گیا اور میرے موضوع ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کو منظوری مل گئی اور میرا ڈی لٹ کے لیے رجسٹریشن ہو گیا۔ پروفیسر احمد لاری، پروفیسر فضل امام اور

پروفیسر سید شریف الحسن کو اس میٹنگ میں مدعو کیا گیا تھا۔ اب میں نے دن کو اسکول جانے سے پہلے اور رات کو گیارہ بجے تک اپنا ڈی لٹ کا مقالہ لکھنے کا معمول بنایا۔ میں نے دن رات میں محنت کی اور مسلسل ساڑھے چار سال کے بعد 20 فروری 2010ء کو ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں ڈی لٹ کا مقالہ داخل کر دیا۔ میرے ایک مخلص اور خیر خواہ نے کہ جس نے مجھے نہ صرف اپنا دوست سمجھا بلکہ میرے ساتھ ایک سگّے بھائی سے بھی اچھا سلوک کیا وہ افضل حسین بستوی (دہلی) ہیں کہ جنھوں نے میرے مقالے کی کمپوزنگ کی اور پورے ایک مہینے تک کمپوزنگ چلتی رہی۔ ہر صفحے پر پچیس سطریں رکھنے کے باوجود میرا مقالہ 780 صفحات پر پھیل گیا۔ مکمل کمپوزنگ کرنے کے بعد مقالے کی پانچ جلدیں ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (اُتر پردیش) میں جمع کرادیں۔ بڑی سخت آزمائشوں اور ذہنی کوفتوں کے بعد فروری 2012ء میں میرا ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں (Viva Voce) زبانی امتحان ہوا۔ پروفیسر فضل امام صاحب، لکھنو یونیورسٹی، پروفیسر انور پاشا صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی اور پروفیسر محمد زاہد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میرے ڈی لٹ کے وائیوے میں آئے تھے۔ مئی 2012ء کو مجھے ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے آڈی ٹوریم میں اُس وقت کے گورنر جناب بی ایل جوشی کے ہاتھوں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی تھی۔ اس کنووکیشن میں انتہائی نیک سیرت اور میرے بھائیوں سے بھی زیادہ مجھے چاہنے والے ڈاکٹر شریف احمد قریشی کو بھی ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی تھی۔

آج تک میری جو کتابیں شائع ہو کر اُردو کے سنجیدہ قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں:۔

ا۔ ''ہزروں غم'' (افسانے)

۲۔ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' (تحقیق وتنقید)
۳۔ ''آئینہ در آئینہ'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۴۔ ''میٹھا زہر'' (افسانے) ''اعتبار و معیار'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۵۔ ''شعورِ بصیرت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۶۔ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' (تحقیق وتنقید)
۷۔ ''اندر کی باتیں'' (افسانے)
۸۔ ''قبر میں زندہ آدمی'' (افسانے)
۹۔ ''ترسیل و تفہیم'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۱۰۔ ''کیا حال ہے جاناں!'' (افسانے)
۱۱۔ ''تناظر و تفکّر'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۱۲۔ ''نئی تنقیدی معنویت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۱۳۔ ''تنقیدی فکر و فن'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۱۴۔ ''کہکشانِ خیال'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
۱۵۔ ''آج میں کل تُو'' (افسانوی مجموعہ)
۱۶۔ ''خارستان کا مسافر'' (خودنوشت سوانح حیات)
۱۷۔ ''ادبی اقدار کی بازیافت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

میں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کو ''خارستان کا مسافر'' عنوان دیا ہے کیونکہ میری نظر میں یہ دُنیا خارستان ہے، گلستان نہیں بالفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کانٹوں کا بچھونا ہے، پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں مجھے درد والم زیادہ نظر آتے ہیں اور خوشیاں بہت کم۔ زندگی کا ہر لمحہ ہر چیز میں جُدائی جُدائی کا اعلان کرتا ہوا گزر جاتا ہے!

☆☆☆

منظومات

☆.....طہور منصوری نگاہ

رباعیات

سینے میں تمناؤں کے طوفان رہے
بے خواب محبت کے شبستان رہے
جس رات کو مانگا تھا خدا سے ہم نے
اس رات بھی ہم کتنے پریشان رہے

☆

ہر وقت مرے ساتھ چلیں دو آنکھیں
دھڑکن کی طرح دل میں پلیں دو آنکھیں
وہ خواب کا عالم ہو کہ بیداری کا
دن رات مرے ساتھ جلیں دو آنکھیں

☆

وہ خواب ،وہ پریوں کا نگر بھول گئے
وہ سات سمندر کا سفر بھول گئے
مٹی میں سنے ہاتھ گھروندوں کے محل
کرتے ہیں بہت یاد مگر بھول گئے

☆

یہ اوس کی تحریر جہاں تک پہنچے
خواہش کی یہ زنجیر جہاں تک پہنچے
ہاں خواب کی تاثیر تو دل تک پہنچی
اب خواب کی تعبیر جہاں تک پہنچے

☆

ٹوٹا ہوا پھر کوئی ستارہ دیکھا
جو ڈوب چکا تھا وہ کنارہ دیکھا
دیکھا بھی تو افسوس مری آنکھوں نے
دیکھا ہوا اک خواب دوبارہ دیکھا

☆

کوئی سا دھو ، فقیر زندہ ہے کیا
کوئی خسرو کبیر زندہ ہے کیا
آواز تو دے کوئی کسی گوشے سے
انسان ترا ضمیر زندہ ہے کیا

☆

☆.....طہور منصوری نگاہ

پاگل جیسا ہی بڑبڑاتا آجا
بادل جیسا ہی گڑگڑاتا آجا
آہو سی چوکڑی نہ بھر پائے تو
گھائل جیسا ہی لڑکھڑاتا آجا

☆

دل میں ہے جو ارمان نکل جائے تو
یہ مرحلہ آسان نکل جائے تو
کیا ہوگا درِ دل پہ تری آہٹ کا
گھبرا کے اگر جان نکل جائے تو

☆

ہے آج بہت گرم ہوا یاد رکھو
ناراض سا لگتا ہے خدا یاد رکھو
جو کام ضروری ہیں وہ کر لو جلدی
اب وقت بہت کم ہے، صبایاد رکھو

☆

اک ساتھ گزاری ہوئی برسوں پہلے
برسات گزاری ہوئی برسوں پہلے
واللہ گزارے نہیں گزری اب تک
وہ رات گزاری ہوئی برسوں پہلے

☆

یادوں کا سفر آنکھ پھڑکنے تک ہے
ہنگامہءخوں دل کے دھڑکنے تک ہے
یہ جسم ،یہ خواہش کا ہوادار محل
سینے میں ہی آگ بھڑکنے تک ہے

☆

شعلوں کا بدن سرد ہُوا جاتا ہے
ہر برگِ چمن زرد ہُوا جاتا ہے
جو درد کہ تھاباعثِ راحت اب
وہ درد بھی سردرد ہُوا جاتا ہے

☆

☆.....جینت پرمار

ایک ستارہ ٹوٹ گرا تھا

خوابوں کی سرحد پہ
نیلا نیلا ایک سمندر
تیری آنکھوں جیسا
لہروں کے نیزوں پہ بہتی
جگمگ جگمگ چاندسی روشن
اپنے پیار کی کشتی
سات سمندر سے بھی دور
طوفانوں سے کھیلتی
جل پریوں سے باتیں کرتی
واپس لوٹ آئی تو
ساحل کی چمکیلی ریت میں
ایک ستارہ ٹوٹ گرا تھا

☆☆☆

پتنگ

کبھی کبھی من کرتا ہے
پتنگ بن کر آسمان میں اڑنے کا
گھر کی ٹوٹی چھت پہ چڑھ کر دیکھتا ہوں
رنگ برنگی کئی پتنگیں
لیکن نیلے آسمان کو
دیکھ نہیں پاتا ہوں میں
دکھائی دیتی ہے بس مجھ کو اپنی پتنگ
آسمان اور مرے درمیاں
حائل ایک پتنگ

☆☆☆

☆.....جینت پرمار

عشق

شام کے دھندلے سائے میں
املی کے اک پیڑ کے نیچے
میری پیشانی پہ لکھا تھا تم
اپنے سرخ لبوں کا نام
سارے بدن میں
ستار کے تاروں نے چھیڑا اک نغمہ
وہی نام اب
میرے لہو کی تنگ گلی میں گانے لگا ہے!

☆☆☆

کوشش

کئی دنوں سے میرے سر میں
صبح شام اور رات رات بھر
ناامید پرندے اڑتے رہتے ہیں
انہیں روکنا مشکل ہے
لیکن اپنی کالی کالی زلفوں میں
گھونسلہ کرنے سے
میں روک تو نہیں سکتا ہوں ان کو

☆☆☆

☆.....خورشید اکرم

دلّی (۱)

یہاں جا بجا پڑے ہیں وہ پتھر
جن پہ پاؤں رکھ کر
بنایا جا سکتا ہے اپنا قبلہ، اپنا کعبہ
دیوار اونچی ہوتی جاتی ہے
اٹھتا جاتا ہے پتھر
گہرے ہوتے جاتے ہیں
پیروں کے نشان پتھر پر
لوگ یہ سمجھتے ہیں
دلی ہی ہے ان کے خوابوں کا نگر
ان کے آسمان کی کگر
مگر
نہ اٹھتی ہے دیوار انت میں
نہ بن پاتا ہے قبلہ
باقی رہ جاتے ہیں پاؤں میں چھالے
اور دل میں
ناسورِ شکست!!!

☆☆☆

دلّی (۲)

کھوئے ہوئے محبوب کے مل جانے کا
سپنا لے کر
(جیسے نیند میں چلتا ہوا ایک آدمی)
کسی سڑک سے گزرتے ہوئے
گمان کرتا ہے
اگلے موڑ
اگلے قدم پر
ٹکرا جائے گا بچھڑے ہوئے محبوب کے
ہاتھ سے ہاتھ
مل جائے گی آنکھ سے آنکھ
بہہ نکلے گی منہ میں ٹھہری بات
پھوٹ پڑیں گے گلے شکوے
دیر ہو جائے گی
ٹوٹ پڑے گی رات
اتنا بڑا، اتنا بے کنار ہے شہر
جیسے تارکول کا سمندر
صرف نیند میں چلتا ہوا آدمی پہنچ سکتا ہے
محبوب کے دروازے پر!!!

☆.....خورشید اکرم

دل شاعر

رات خیال کا دریا رواں تھا
دل دنیا کے دردوں سے بھرا تھا
ان میٹھے دردوں سے جن سے خوابوں کی
فصل لہلہاتی ہے
خواب جس کی کھیتی انسان کرتے ہیں
خواب جس میں خود کو شاعر دیکھا
زندگی کا مغنی جو خزاں میں
نوید دیتا ہے فصل گل کی

رات ارادہ کیا مستحکم
خیال رکھوں گا اس دنیا کا
فکر کروں گا
اور لٹاؤں گا اس پر اس سے بھی زیادہ
جتنا مرا اندوختہ ہے
رات منصوبہ بنایا
دھرتی کو ہموار کرنے کا
اور پھر گلزار کرنے کا

صبح باپ نے آواز دی
(انہیں کچھ درکار تھا!)
شاید کھانا، شاید دوا، شاید دھوتی
ماں نے بتایا
اپنے گھٹنوں کے درد کا
بیوی نے پاس آ کر پوچھا
بیمہ کی ادائیگی کا
بیٹے نے فہرست بڑھائی
فیس، کتابیں، چھتری، جوتے، بوٹ،
فٹ بال کے
خالہ نے کہلا بھیجا ہے
چھت کی مرمت دیواروں کے رنگ
روغن کا
ورنہ شاید ڈھ جائے گی نانا کی ڈیوڑھی

☆.....خورشید اکرم

دوست کے بابا پھسل گرے تھے
کولہا ٹوٹ گیا ہے
ان کے لئے ہسپتال جانا ہے
اے۔ٹی۔ایم سے ہوکر

دنیا کی فکر سمائی ہے دل میں
دنیا جو بہت بڑی ہے، بہت بے ہنگم

دنیا کی فکر کرنے والے شاعر دل
باپ ماں بیوی بیٹی
دوست بھائی
خالہ تائی
یہ جو تیرے دھی کٹمب ہیں
تُو جو اِن کا جایا ہے
یہ بھی تیری دنیا ہیں
حصہ ہیں تیرے ہونے کا

شاعر میرے!
دنیا کے غم میں روتا ہے کیوں؟

اک گیت ہے تیرے حصے کا ،اسے
گائے جا
اور گاتے گاتے اس دھرتی کے پار نکل جا
!!

☆☆☆

☆.....ارشد عبدالحمید

مجہول

میں اس دنیا کا حصہ ہوں
یہ دنیا ہے پہچان مری

یہ نظم وغزل یہ شعروادب
یہ سچائی یہ نرم روی
یہ سادہ مزاجی صدق دلی
یہ اخلاق وآداب مرے
یہ سب میرے ہی عناصر ہیں
یہ سب میرے ہی پردے ہیں
جو میری اصل چھپاتے ہیں
مجھے ایک انسان بناتے ہیں

لیکن میں فقط اتنا ہی نہیں
وہ جھوٹ جو میں نے بولے ہیں
وہ درد جو میں نے پالے ہیں
وہ غم جو دیئے خود کو میں نے

وہ خواب جو میں نے ڈھالے ہیں
وہ ضرب ودغا
وہ رنج ووغا
وہ دامِ انا
وہ دانہء کبر ومکر وریا
دنیا میں جو میں نے اچھالے ہیں
یہ جز ولاینفک ہیں مرے
یہ میری ذات کے جالے ہیں

ان جالوں سے کیسے نکلوں
مکڑی جالے ہی بنتی ہے
میں کیسے بکھرنے کو روکوں
دھنکی تو روئی ہی دھنتی ہے

میں وہ بھی نہیں جو سیدھا ہے
میں وہ بھی نہیں جو الٹا ہے
اس الٹے سیدھے کے اندر

☆.....ارشد عبدالحمید

لفظ کی لاغری

اک فاعل ہے
اک فعل بھی ہے
میں فعل نہیں، فاعل بھی نہیں
مفعول نہیں، منقول نہیں
مجہول ہوں میں، مجہول ہوں میں

میں اس دنیا کا حصہ ہوں
سو کچھ بھی نہیں پہچان مری

☆☆☆

میں دیکھ رہا ہوں
کہ الفاظ
اپنی ایکسپائری کی تاریخ سے
بہت پہلے
بیکار ہوتے جا رہے ہیں
جو لفظ کبھی فربہ اور تنومند تھے
اب نحیف و نزار
اپنے ضعف کی پاداش میں
کاسہ لیسی پر مجبور ہیں

ابھی میں نے دیکھا
کہ ایک شخص نے
ایک امیر سے کہا
اگر آپ مجھے کھانا کھلا دیں

☆.....ارشد عبدالحمید

میں دیکھ رہا ہوں
کہ الفاظ
اپنی ایکسپائری کی تاریخ سے
بہت پہلے
بیکار ہوتے جا رہے ہیں
جو لفظ کبھی فربہ اور تنومند تھے
اب نحیف ونزار
اپنے ضعف کی پاداش میں
کاسہ لیسی پر مجبور ہیں

ابھی میں نے دیکھا
کہ ایک شخص نے
ایک امیر سے کہا
اگر آپ مجھے کھانا کھلا دیں
تو آپ کی نوازش ہوگی
امیر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا
کہ نوازش کا لفظ
دھڑام سے نیچے آ گرا

لگتا ہے کہ کھانے کی ضرورت
سائل سے بھی پہلے
نوازش جیسے الفاظ کو ہے
کہ ان کی لاغری
اب کسی جذبے کا
بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے

☆☆☆

☆.....نجمہ ثاقب

تعارف

سر پہ خوف شجر کا سایہ
اور چنریا کالی تھی
دل کے سُندر بن میں اس دن
بارش ہونے والی تھی
ایسے میں اک پیڑ کی گیلی
شاخ پہ اتری سرد ہوا
بولی، اپنا نام بتا
میرے اندر ناگ سنہرا
تنہائی کا جاگ اٹھا
بل کھا کے
تھوڑا اٹھلا کے
بولا
میں بیساکھ کا بادل
میں سوکھا دریا
میں درویش کی کٹیا سونی
میں خالی درگاہ

☆☆☆

شام

شام کی روشنی
شام کی روشنی ملگجی گھاس پر
مرگھلے پیڑ کی زرد تصویر ہے
آسمانوں کی سرحد سے بھیجی گئی
خون آشام سورج کی تحریر ہے
دن کے لاشے پہ روتی ہوئی سینہ زن
شام نوحہ کناں ۔۔۔۔ پابہ زنجیر ہے
شام دلگیر ہے

☆☆☆

☆.....نجمہ ثاقب

بڑھاپا

اک دن یوں ہی بیٹھے بیٹھے
کرسی پر میں اونگھ رہا تھا
پچھلی جانب دھوپ کھڑی تھی
اور مرے گھٹنے کی اونچی
مینڈھ پہ ایک کتاب دھری تھی
ورقوں پہ رنگ کھیل رہے تھے
جلد پہ تھوڑی گرد پڑی تھی
جوں ہی میں نے پیچھے ہٹ کے
پشت سے اپنی کمر ٹکائی
ورقوں کی رنگین قبا سے
ایک کہانی باہر آئی
خواب میں میرے سیندھ لگائی
میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں
پہلو میں عینک کو ٹٹولا
ورقوں کا انبار پھرولا
میز کھنگالی، دامن جھاڑا
کوٹ کی جیب کا استر پھاڑا
پوتے کو آواز لگائی
بہو بھی دوڑی دوڑی آئی
گھر کا اک اک کونا چھانا
سوچ کے دھاگوں میں الجھایا
اندازوں کا تانا بانا
الماری کا خانہ دیکھا
کھول کے بکس پرانا دیکھا
چادر جھاڑی، سرہانہ دیکھا
آخر تنگ آ کے کمرے میں
بستر کے اوپر جا لیٹا
مایوسی کی حالت میں جا
گنجا سر اور ماتھا پیٹا
ذہن کے گلیارے میں یادکی
دھندلی سی دیوار گری تھی
انگلی کی پوروں پہ دھیرے
دھیرے اپنا لمس جگاتی
عینک میرے سر پہ دھری تھی

☆☆☆

تمہاری آنکھوں کو دیکھ سکتا ہوں

نظم

تمہاری آنکھوں کی گنگا کو
میں دیکھ سکتا ہوں
تمہاری آنکھوں کی گہرائی میں بسے
اَن دیکھے خوابوں کو دیکھ سکتا ہوں
میں ان حسین خوابوں میں
اپنے آپ کو امر ہوتے ہوئے
دیکھ سکتا ہوں
تمہاری آنکھوں کی گنگا کو میں دیکھ سکتا
ہوں
مگر...!
ان آنکھوں کے پوتر پانی کو
بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا
میں ان پانیوں میں
تیرتی ہوئی
اپنی استھیاں
کیسے دیکھ سکتا ہوں؟

☆☆☆

کل رات
میری نظریں
نہ جانے کس کی تلاش میں
رات بھر...
ڈبکیاں لگاتی رہیں
نہاتی رہیں
شرابور ہوتیں رہیں
چاند کی سنہری جھیل میں!!
اور
آج رات
چاند
نہ جانے کس کی تلاش میں
بھٹکتا پھر رہا ہے
میری آنکھوں کے صحرا میں ...!!!

☆☆☆

زندگی جینے کا بھرم

جی لیا تم نے
چلو
اب موت جی لو
زندگی سے پیار کا بھرم تو
ٹوٹ جائے گا
آنکھوں کو خواب دیکھنے
کی عادت ہے
اور خواب ٹوٹنے پر رونے کی
چلو اب کے
ٹوٹے ہوئے خوابوں کو دیکھ لو
نظریں حقیقت آشنا
ہو جائیں گی
اپنے آپ کو پکارنے کا
پاگل پن چھوڑ دو

تم کبھی اپنے آپ میں
تھے ہی نہیں
تو کون تمہیں خواب دے گا؟
آسماں تم سے کافی دور ہے
ایک تماشائی
جو تمہارا
کچھ نہیں لگتا
دھرتی تمہاری ماں ہے
جھک کر اپنا دکھڑا
دھرتی کو سناؤ
وہی تمہیں سمجھ
سکتی ہے
تمہیں کھا سکتی ہے

☆☆☆

کہنہ مشق (مٹھی بھر نظمیں)

☆.....زاہد مختار

تنکے کی تقدیر

شہرِ بے حس کے سارے مکیں آج
کیوں
شام ڈھلتے ہی پھر سے سِر کنے لگے
ذرہ ذرہ سمیٹے ہوئے وہ بدن
جب بھی گزریں گے گاؤں کے چوپال
سے
وہ جو عریاں ہے بے عار بوڑھا شجر
وہ تو صدیوں سے انصاف کے نام پر
اندھی، بہری لکیروں کے اِک جال میں
قید کرتا ہے انساں کی تقدیر کو
آج بھی اپنی خاموش دُنیا میں گُم
میٹھے لمحوں کو مُٹھی میں جکڑے ہوئے
اپنے سائے کے دامن پہ لکھ جائے گا
ایک تنکے سے تنکے کی تقدیر کو

☆☆☆

تماشا

مان لو اِک بات
تُم بھی اِس نئے خاموش رستے پر
ہزاروں بھاگتے لوگوں سے مل کر
جا کے دوڑو
دوڑ
کہ بہتر ہے تماشائی سے تیرا
اِک تماشا بن کے جی لینا

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

حقیقت

حقیقت
خوابوں کی طرح رنگین نہیں ہوا کرتی
کہ آنکھیں موندے آدمی دیکھنے کی چاہ کرے

حقیقت
تلخ ہوتی ہے زہر کی طرح
جس کو پینا پڑتا ہے سقراط بن کر

حقیقت
وصل کی شب نہیں کہ جی چاہے اس کی
سحر نہ ہو

حقیقت
سرخ دن ہے کہ جس کے تپتے صحرا کی
گرم ریت پر چلنا پڑتا ہے

حقیقت
تُو نہیں کہ مِل جاؤ سرِ راہ اور کھو جاؤں
تمہاری بانہوں میں

حقیقت گُہر ہے کہ مِل جاتا ہے سمندر
میں کھو جانے کے بعد

اور یہی حقیقت
پاتے ہی اوب جاتا ہے دل دُنیا سے
کہ دنیا اصل میں حقیقت نہیں

☆☆☆

آس

میرے گھر کے ہر تنکے نے تیری باتیں سُن
لی ہیں
اور وہ تیرے وعدۂ فردا کو سچ سمجھے بیٹھے ہیں
ہر آہٹ پہ اُن کا دل کیوں فریادی بن جاتا ہے
شاید تیرے آنے کے سب لمحے گنتے رہتے
ہیں
تُم آؤ گے.....کب آؤ گے
کس کس سے میں کیسے کہوں
کیسے کیسے قصے گھڑ لوں اور افسانے کس
سے کہوں
میری مانو اِک خط بھیجو لے کر کوئی ایسی بات
طوفاں لے کر جو آجائے، تنکا تنکا بکھرے
آس!!

☆☆☆

☆......زاہد مختار

قلم ہاتھوں کو کر لینا

لُٹا کر عمرِ رفتہ کو
سمیٹے ایک کوزے میں
اُٹھا لائے تھے جو قطرے
وہ مہندی بن کے ٹپکے تھے
کئی صدیوں کا قصہ ہے
کئی برسوں کی باتیں ہیں
کہ اک دن
بس نہ جانے کیوں
ڈبو کر اُنگلیاں اُس میں
لکھا مصرعہ ہتھیلی پر
''قلم ہاتھوں کو کر لینا''
اور اب ہم دور دُنیا سے
سمندر بنتے جاتے ہیں
اچانک اِک لفافے نے
درِ دل پر جو دستک دی
طلاطُم خیز موجوں نے
لفافہ کھول کر دیکھا
رچی اِک تازہ مہندی میں
بہت ہی خوبصورت سی
کٹی کوئی ہتھیلی تھی
ہتھیلی پر وہ مصرعہ تھا
''قلم ہاتھوں کو کر بیٹھے''

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

یادِ ماضی

میں نے سُنا ہے
سچ ہی ہوگا
خوابوں کے وہ دوگز پا کر
تُم نے چھوٹے سے اِک گھر کو
تنکا تنکا ہے یوں سجایا
جیسے دُلہن کا چہرا ہو
اچھا ہے
پر اِتنا بتا دے
اپنے گھر کے اُس آنگن میں
دور کسی کونے میں تنہا
ماضی کی اِک قبر بنی ہے !!

☆☆☆

آبلہ پا(۱)

تُم سمجھتی ہو شاید کہ ہم
آج تک
اِک تصور کے رستے پہ
چلتے رہے
کوئی احساس تُم کو نہیں یہ سفر
آبلے کتنے پاؤں کو دے کر گیا

☆

آبلہ پا(۲)

کاسۂ گدا میں
ایک دہکتی شئے
چھناک سے گری
اور بھکاری
بھیک اور بھوک
دونوں سے نجات پا گیا

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

ایک بار پھر

آؤ
دو پل ساتھ مِل کر
پھر اُسی اِک خواب کو دیکھا کریں
پھر کسی گُم صُم سی دُنیا کے کسی خاموش
گوشے میں
اُسی انداز سے خاموش بیٹھیں
آؤ
سوچیں اِک نئی تدبیر ایسی
ہاتھ کی پھیلی لکیروں کو کسی نکتے پہ روکیں
اور پوچھیں حالِ دِل، احوالِ جاں
آؤ
پھر اِک تیر پھینکیں
یوں اندھیرے میں کسی مبہم نشانِ راہ پر
یا چلو پھر سے بھٹک جائیں
کسی صحرا کی تپتی ریت پر

☆☆☆

ساتھی

تیرے آنگن میں اُترا ہے جو شان سے
میرے آنگن میں جس نے اُجالا کیا
روز آتا ہے پریوں کے اُس دیس سے
جو مرے خواب رنگین کرتا رہا
اور جاتا ہے شاید وہیں لوٹ کر
جس جگہ تیری یادوں کا گلشن سجا
آنے جانے میں لاتا ہے جو نت نئے
خواب، پلکوں کی چلمن کو دے جاتا ہے
یہ وہی چاند ہے
یہ وہی چاند ہے

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

آئینہ

اُٹھاؤ ہاتھ
وہی ہاتھ
جو میری آواز کو وقت کا اسیر بنا کر
خوش ہیں !
جو میری یادوں کو دفنا کر
مسرور ہیں!
اور جنہیں میرے دل کے دریچے بند
کرنے میں ملتا ہے
ایک پُر کیف لمحہ!
آج وہی ہاتھ اُٹھا کر
مانگو دعا
کہ اِن صفحوں کی سیاہی مٹ جائے
کیونکہ اب
یہ سیاہی
تم روز دیکھو گے
اپنے آئینے میں !!

☆☆☆

ہندسے کا سفر

میرے سامنے
ایک خوبصورت چھوٹی سی گھڑی
خاموش رقصاں ہے اپنے محور کے گرد
لمحہ لمحہ
اُس کی تھرکتی سرخ سوئی
کالے سُنہرے چہرے کے اوپر
جیسے پکڑنے کی کر رہی ہے جستجو
ایک، دو، تین، چار، کالے ہندسوں کو
اور شاید بے خبر ہے
کہ اگلے ہندسے کو پکڑنے کی جستجو میں
پھسل جاتا ہے اُس کے ہاتھوں سے
ہاتھ آیا ہوا پچھلا ہندسہ!

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

خاموشی

آواز کا پردہ
شاید برسوں پہلے
کسی زوردار آندھی کے
سامنے
ٹھہر نہ سکا
اب گرج، گونج
گھنگھور گھٹائیں اور
گرتی ہوئی دیواروں کا شور
سنائی نہیں دیتا.....
خاموشی قبرستان کی
کتنی بھلی لگتی ہے

☆☆☆

نیا جنم

چشمہ لگا کے
میں نے آج
جھوٹ کے اتنے موٹے موٹے حروف
پڑھے!
کہ آنکھیں دُکھنے لگیں
اب میں نے
چشمے کے ساتھ
آنکھیں بھی میز پہ رکھ دی ہیں

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

داستان، بکھری سی

برسوں کی بات نہیں
صدیاں بھی تمہیں ملتی
تب بھی تُم مجھے نہ سمجھتی، نہ جانتی
کیونکہ
تُم نے مجھے ہمیشہ ایک بند کتاب جان کر
پڑھنا چاہا
لیکن میں ورق ورق بکھری ایک کہانی
ہوں
جسے میں خود نہیں پڑھ پایا
تمہارا دعویٰ غلط ہے
کہ تم ایک ہی نشست میں مجھے پڑھ چکی
ہو
کیونکہ
بکھری داستان جوڑی نہیں جاتی

☆☆☆

افسانہ

دور فلک کی اونچائی پر
اُڑتے ہوئے اِک پنچھی نے
نیچے پھیلی اس دھرتی پر
نگاہ دوڑا کر یہ سوچا
کہتے ہیں اس دھرتی پر تو
سب کچھ ملیا میٹ ہوا
چاول، روٹی، خونی کپڑے
کولا، مٹی اور سامان
بچے، بوڑھے، پردہ نشیں کی
ہڈیاں ہڈیاں سب یکسان
میری کوئی تیز نظر بھی
کیسے چُن لے اِک دانہ
اب یہ شہر بھی افسانہ

☆☆☆

☆.....زاہد مختار

نیا جنم

رہنے دو
مت کُریدو دیوار کے زخم
کھرچنے سے
ممکن ہے
انارکلی دوبارہ زندہ ہو جائے !

☆☆☆

سوال

وہ کب کا مر گیا
لیکن لوگ
آج بھی مثلِ سوال ہیں
کیسے مرا ؟
کیونکر مرا ؟
کس پل مرا ؟
کبھی اُس سے عمر بھر
کسی نے یہ نہیں پوچھا
کیسے جیا ؟

لامنتہا

میں نے کہا تھا
آؤ گھر کے سارے کلینڈر پھاڑ دیں
آئینے توڑ دیں
اور ساری یادیں جلا کر
اُن کی راکھ
جہلم میں بہا دیں
اور اُس نے
اپنا کلیجہ نکال کر
میری ہتھیلی پر رکھ دیا

☆

حاشیہ

برسوں پہلے
میں نے تمہیں حاشیہ پر رکھ کر
اپنی کہانی لکھی تھی
آج میں خود
حاشیے پہ کھڑا
اپنی کہانی میں
صرف تمہیں پاتا ہوں

فکر فردا (فلک رنگ غزلیات)

☆.....اشہر اشرف

حسنِ جاناں نے کیا ہے ہمیں مسحور ذرا
دیدۂ شوق نے بھی کر دیا محصور ذرا
جان پر میری بن آئی ہے خدا خیر کرے
چشمِ قاتل کو کرے اب کوئی مستور ذرا
شہر میں ہم سے کہاں پہلے کوئی واقف تھا
نسبتِ یار سے ہم بھی ہوئے مشہور ذرا
ہر کوئی جان ہتھیلی پہ یہاں رکھتا ہے
شہرِ دل کا بہ خدا ہٹ کے ہے دستور ذرا
ہم کو مت سہل سمجھنا ارے نادان کبھی
بس کہ ہم وقت کے ہاتھوں ہوئے مجبور ذرا
ہر قدم سوچ کے ہم کو اب اٹھانا ہوگا
بس کہ منزل ہے ہماری ابھی کچھ دور ذرا
مشکلوں سے کبھی گھبراتے نہیں اشہرؔ ہم
یہ کہ حالات سے لیکن ہوئے رنجور ذرا

☆☆☆

تمام عمر کیا ہے فقط سفر میں نے
تجھے تلاش کیا ہے نگر نگر میں نے
ہوائے تند نے بھی آزمائے زور بہت
رکھے بلند سدا حوصلے مگر میں نے
میں رنگ و بو کے نظاروں سے بچ کے چلتا ہوں
کیا ہے دشتِ جنوں کو ہی ہم سفر میں نے
بھلا دیا ہے تمہیں اور بھلا دیا خود کو
بھلا دی جب سے تمہاری وہ رہگزر میں نے
کیا ہے جب بھی کسی نے وفا کا ذکر اشہرؔ
ترا حوالہ دیا بات بات پر میں نے

☆☆☆

☆.....اشہر اشرف

تیرے جانے سے ہوا دل دشتِ ویراں کی طرح
شہر سارا لگتا ہے اجڑے گلستاں کی طرح
میں نے مانگا ہے دعاؤں میں تمہیں تقدیر سے
تم دل و جاں میں بسے ہو جانِ جاناں کی طرح
قلبِ مضطر میں ترے دیدار کی حسرت لئے
بس تری دہلیز پر بیٹھا ہوں درباں کی طرح
میں نے کیا کیا خواب دیکھے ہیں تمہاری دید کے
بام پر آؤ کبھی تم ماہِ تاباں کی طرح
کیا بتاؤں، کیسے سمجھاؤں مسائل کتنے ہیں
زندگی الجھی ہوئی ہے زلفِ پیچاں کی طرح
ساری دنیا گھوم کے دیکھا ہے میں نے باخدا
کوئی چہرہ ہی نہیں آیا نظر ماں کی طرح
زندگی نے ایسی کروٹ لی ہے اشہر کیا کہوں
اب تو اپنے گھر میں بھی رہتا ہوں مہماں کی طرح

☆☆☆

اگر زندوں میں رہنا ہے، بدلنے کی ضرورت ہے
زمانے کے مطابق ہم کو ڈھلنے کی ضرورت ہے
زمانے میں ہمیں بھی اب سنبھلنے کی ضرورت ہے
ہمیں اب رخ ہواؤں کا بدلنے کی ضرورت ہے
کیا رسوا بہت اب تک ہمیں اس بے خودی نے بھی
حصارِ بے خودی سے اب نکلنے کی ضرورت ہے
کنارے پر تماشہ یوں کہاں تک دیکھ لیں گے ہم
ابھی لہروں کے رخ پر ہم کو چلنے کی ضرورت ہے
ابھی تک سنگِ مرمر پر چلے ہیں ہم بہت لیکن
ہمیں اب خارزاروں پر بھی چلنے کی ضرورت ہے

☆☆☆

☆.....اشہر اشرف

چلو منزل کی جانب ہم قدم اپنے بڑھائیں گے
بدل کے رخ ہواؤں کا زمانے کو دکھائیں گے
اگر ہمت دکھائیں گے قدم اپنے جمائیں گے
زمیں کیا ہے فلک سے ہم ستارے توڑ لائیں گے
اٹھو ہم حوصلہ اپنا ذرا سا آزمائیں گے
غموں کے دور میں بھی ہم چلو اب مسکرائیں گے
اندھیروں میں ستاروں کی طرح ہم جگمگائیں گے
ہوئے گمراہ جو اُن کو چلو رستہ دکھائیں گے
خزاں کی رت گزر جائے گی، کلیاں مسکرائیں گی
شجر پھر سے ہرے ہوں گے پرندے لوٹ آئیں گے
چلو کچھ کام ایسا زندگی میں کرتے ہیں اشہؔر
نقوشِ راہ دنیا میں ہم اپنے چھوڑ جائیں گے

☆☆☆

چہرے پہ نگاہیں تھیں، جھک کر نہیں دیکھا ہے
جو ہاتھ میں تھا تیرے خنجر نہیں دیکھا ہے
اس نے بھی کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ہے
ہم نے بھی کبھی آگے بڑھ کر نہیں دیکھا ہے
منزل کی محبت میں کانٹوں سے گزرتے ہیں
مشکل تھا مگر ہم نے مُڑ کر نہیں دیکھا ہے
آنکھوں میں گزاری ہے رو رو کے اذیت میں
جب شام ڈھلے تم کو چھت پر نہیں دیکھا ہے
اس کو یہ شکایت ہے روکا نہیں ہے ہم نے
ہم کو گلہ ہے اس نے مڑ کر نہیں دیکھا ہے
دنیا میں کئی عاشق گزرے ہیں مگر ہم نے
دیوانہ کوئی تم سا اشہؔر نہیں دیکھا ہے

☆☆☆

☆.....اشہر اشرف

اپنی نہیں ہے اور نہ سنسار کی خبر
آئی نہیں ہے جب سے مرے یار کی خبر
ہوتی نہیں ہے اب کوئی معیار کی خبر
پڑھتا نہیں ہے اب کوئی اخبار کی خبر
آیا ہے کیا وہاں سے کوئی لوٹ کے کبھی
کون اب سنائے گا مجھے اس پار کی خبر
کہنا کہ زندہ ہے وہ مگر زندگی نہیں
پوچھے گا تجھ سے جب دلِ بیمار کی خبر
سب کو خبر ہے موج کہاں رخ بدل گئی
رکھتا نہیں ہے ہر کوئی منجدھار کی خبر
نایاب ہوگئی ہیں سخن کی وہ محفلیں
اشہر کسے یہاں ہے قلم کار کی خبر

☆☆☆

شبِ ظلمت میں بھی ہم روشنی کی بات کرتے ہیں
غموں کے دور میں بھی ہم خوشی کی بات کرتے ہیں
ہزاروں خواہشیں دل میں لئے چلتے ہیں ہر لمحہ
اجل رقصاں مگر ہم زندگی کی بات کرتے ہیں
ہمیں معلوم ہے اوقات اپنی کیا ہے دنیا میں
مگر پھر بھی ہمیشہ ہم خودی کی بات کرتے ہیں
غمِ دنیا کے مارے ہیں، مقدر کے ستائے ہیں
زمانے میں مگر ہم دل لگی کی بات کرتے ہیں
زمانہ دشمنی کی بات کرتے کرتے گزرا ہے
چلو کچھ دیر اشہر دوستی کی بات کرتے ہیں

☆☆☆

☆.....اشہر اشرف

شعلہ جب دل سے اٹھے گا تو غزل ہو جائے گی
زخم دل پر جو لگے گا تو غزل ہو جائے گی
بے دلی میں دن ڈھلے گا تو غزل ہو جائے گی
دردِ فرقت میں جلے گا تو غزل ہو جائے گی
ہوش میں لکھنا کمالِ فن نہیں ہے بے خبر
بے خودی میں جب لکھے گا تو غزل ہو جائے گی
آنکھوں سے آنکھیں ملیں گی، دھڑکنیں رک جائیں گی
رخ سے جو پردہ ہٹے گا تو غزل ہو جائے گی
آئینہ جب خندہ زن ہوگا تمہارے حال پر
وقت جب تم پر ہنسے گا تو غزل ہو جائے گی
رات دن اشہر تفکر میں گزر جائیں تو کیا
لذتِ گریہ چکھے گا تو غزل ہو جائے گی

☆☆☆

فلک کی چال بدلنے میں وقت لگتا ہے
زمیں سے راز اگلنے میں وقت لگتا ہے
کسی کے دل سے نکلنے میں وقت لگتا ہے
کہ چوٹ کھا کے سنبھلنے میں وقت لگتا ہے
اداس موسموں میں گل ٹھہر کے کھلتے ہیں
ہواؤں میں دیئے جلنے میں وقت لگتا ہے
قریب آ کے مٹیں گے یہ فاصلے سارے
جمی ہے برف، پگھلنے میں وقت لگتا ہے
بدل سکو گے اگر خود کو تو بدل ڈالو
مزاجِ کہنہ بدلنے میں وقت لگتا ہے
ہر ایک لمحہ قیامت کی طرح ہے اشہر
شبِ فراق کے ڈھلنے میں وقت لگتا ہے

☆☆☆

افسانے

☆.....عبدالغنی شیخ

مدھ بھرے رومانی خطوط

مجھے مدھ بھرا ایک رومانی خط ملا۔جس میں میری مطبوعہ کہانی ''چوں چوں کا مربہ'' کی تعریف کی گئی تھی ۔مکتوب نگار ایک خاتون تھی ۔ میں چونکا ۔ ایسا ہی ایک رومانی خط تین دہے پہلے مجھے آیا تھا۔ جب میری کہانی 'الوکا پٹھا' کی بڑی تعریف کی گئی تھی ۔تب بھی لکھنے والی نام کی مناسبت سے ایک عورت تھی ۔لکھا تھا'' آپ کا ہاتھ چومنا چاہتی ہوں ۔خط کا جواب ضرور دیں ۔''

میں نے اپنی کہانی ''الوکا پٹھا'' دوبارہ پڑھی اور اظہار تشکر میں ایک خط لکھا تھا ۔اس کا جواب آیا۔ پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں ۔ دوسرے خط میں راز و نیاز کی باتیں تھیں ۔'' میں ایک لمحہ بھی آپ کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی ہوں ، میرے خیالوں پر صرف آپ چھائے رہتے ہو۔آپ کو اپنا دل کیسے دکھاؤں ؟ رات کو تارے گنتی ہوں یا آپ کی کہانیاں پڑھتی ہوں ۔کبھی گھنٹوں آپ کی یاد میں کھوئی کھوئی رہتی ہوں ، ایسے میں نیند آجاتی ہے ۔صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو سب سے پہلے آپ کا نام ذہن میں آجاتا ہے ۔آپ کی تصویر ہمیشہ میرے سینے سے لگی رہتی ہے ۔''میں نے جواب لکھا۔

''محترمہ، میں شادی شدہ ہوں ۔دو بچوں کا باپ ہوں ۔''

جواب آیا''تو پھر کیا ہوا۔کرشن چندر شادی شدہ نہیں تھے؟''

میں نے جواب میں لکھا۔''میرا مقابلہ کرشن چندر جیسے عظیم ادیب سے نہ کرو۔''

''آپ میرے لئے کرشن چندر ہیں ۔چیخوف ہیں ۔ او ہنری ہیں اور موپاساں ہیں'' اس نے جواب میں لکھا تھا۔

پھر اس کے خطوط تسلسل سے آنے لگے ۔ فصیح اور بلیغ اردو میں وہ نیلے سنہرے اور گلابی رنگ کے کاغذ پر خط لکھتی ۔۔کونے پر ''فور گیٹ می ناٹ'' لکھا ہوتا یا ہاتھ سے پھول کی تصویر بنی ہوتی ۔اس کی تحریر کی خوش خطی میں ایک دلکشی تھی ،کوئی دھبہ نہیں ۔ خط کے ساتھ گلاب کے پھول کی چند پنکھڑیاں ہوتیں ۔لفافہ کھولنے کھولتے ہی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آتی ۔ میں مکتوب نگار کی ادا کا شیدا اور اس کی خوش سلیقگی کا جی جان سے فدا تھا۔اور جواب دئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان دنوں خط و کتابت کو آدھی ملاقات سمجھی جاتی تھی ۔سیل فون تو درکنار لینڈ لائن بھی خال خال ہوتا تھا۔خطوط نگاری ہی خیر وخیریت پوچھنے اور اظہار خیال کا واحد ذریعہ تھا۔

خطوط اپنے شہر سے لکھے جاتے تھے ۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے مکان کے پچھواڑے مکان کا کوئی مکین یہ خطوط لکھ رہا ہے اور انہیں پڑھتا ہوا ایسا گماں ہوتا تھا کہ دو آدمی فون پر بات کر رہے ہیں ۔اپنی وردی میں وردی پوش جوان ڈاکیہ بڑا چاق و چوبند لگتا تھا۔ وہ مجھے سلیوٹ کرتا تھا اور باقاعدگی سے اپنا خط چھوڑ کر چلا جاتا تھا، میں کبھی کبھی ایک دو روپیہ اس کو انعام میں دیتا تھا۔۔تب ایک روپیہ کی بڑی قیمت تھی ۔ اب کے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں مکتوب نگار اور ڈاکیہ میں ملی بھگت تو نہیں ۔مکتوب نگار کا پتہ مبہم تھا۔ میں نے لکھا ،تمہارا پتہ واضح نہیں ہے جس محلے کا نام دیا ہے ۔ وہاں سینکڑوں کنبے رہتے ہیں ۔اگر پتہ واضح ہوتا۔تو مجھے تم سے ملاقات کرنے میں مسرت ہوتی ۔

''جو کوئی کوئے یار میں رہتا ہے، وہ پتہ نہیں دیتا۔اگر ٹھیک پتہ دوں تو رقیب کو معلوم ہوگا'' اس نے جواب میں لکھا تھا۔

مجھے رقیب سے کیا لینا دینا۔'' میں نے لکھا۔

اس نے جواب میں لکھا۔

''وہ دن جلد ہی آنے والا ہے جب آپ میرے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ کھڑکی کھلی رہے گی اور آپ سورج کو غروب ہوتے اور پہاڑی کی اوٹ سے چاند کو طلوع ہوتے ہوئے اکثر دیکھا کروگے''۔

''تم مجھے اپنے گھر میں قید رکھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟'' میں نے لکھا۔

''چاند اور سورج کا ملن دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا'' یہ اس کا جواب تھا۔ ایک روز لکھا تھا۔'' آپ کی تحریر میں پی جی ووڈ ہاوس کی ظرافت کی چاشنی ہے۔ سومرٹ مام کا مشاہدہ اور ارنسٹ ہمینگ وے کے تجربے ہیں۔ آپ کی ہر کہانی میں وحدت تاثر ہے۔''

خدارا مجھے بانس پر نہیں چڑھاو۔ میں نے لکھا'' بہر حال مجھے یہ ماننا پڑے گا کہ تم نے غیر ملکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن تم نے اپنے اردو ادیبوں کے بارے میں بہت کم تذکرہ کیا ہے۔'' مجھے کرشن چندر کی رومانیت، مجتبیٰ حسین کی طرافت، سعادت حسن منٹو کی عریاں نگاری، عصمت چغتائی کی دیدہ دلیری اور راجندر سنگھ بیدی کی حقیقت نگاری بڑی پسند ہے۔ آپ کی نئی کہانی ''چھچھوندر کا جنازہ'' ظرافت اور رومانیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

ایک روز لکھا تھا۔'' الو کا پٹھا'' ہے پڑھ کر کبھی آپ کی تصویر اور کبھی الو کا منہ دیکھتی ہوں۔''

''کیا میں الو لگتا ہوں؟'' مجھے بڑا غصہ آیا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آپ نے ایک مادہ الو کو الوؤں کی دنیا کی حسینہ عالم کے روپ میں پیش کیا ہے۔ تب سے مجھے الو اچھا لگتا ہے۔ آپ اپنا غصہ تھوک

دیجئے'' اسی خط میں لکھا تھا'' جی چاہتا ہے کہ آپ میری آنکھوں کے سامنے بستر پر دراز رہے اور میں آپ کے لئے ناشتا تیار کروں، چھولے پوری اور کھیر کھلاوں''۔

مجھے چھولے پوری پسند نہیں ہے۔'' میں نے لکھا۔

'' پھر کھانے پینے کی کیا کمی ہے۔'' اس نے جھٹ لکھا۔'' بٹر ٹوسٹ، مربہ، دودھ اور برن دیٹا، پورج، ابلے ہوئے انڈے اور پھلوں کے جوس، آپ کو کون سا جوس پسند ہے؟ سنترہ، پین ایپل، یا آم؟ دستر خوان بچھاؤں؟ یا ڈائینگ ٹیبل پر سجاؤں؟

'' مجھے نان اور نہاری پسند ہیں۔ اور انار کا جوس پسند کرتا ہوں۔'' ٹھیک ہے آپ کے لئے نان اور نہاری لائیں گے'' پھر سوال کیا تھا۔'' الو کا پٹھا'' کے بعد آپ نے کون سی کہانی لکھی ہے؟'' چابی کا لٹھا''۔

'' آپ کی کہانیاں ہم قافیہ ہوتی ہیں۔'' آپ نے مرغ کی بانگ'' کے بعد'' گدھے کی ہانک'' لکھی'' گدھے کی دم'' کے بعد کیا آپ نے کوئی نئی کہانی لکھی ہے؟'' اگر نہیں لکھی ہے تو مجھے ایک عنوان سوجھا ہے'' گھوڑے کا سم'' یہ عنوان پسند آئے۔ تو ایک کہانی اسی عنوان سے لکھیں''۔

میں نے جواب دیا'' میں ضرور لکھوں گا'' پھر اس نے سوال کیا تھا۔' آپ ہمیشہ جانوروں اور پرندوں پر کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہو نہ ہو۔ ان سے ماضی میں آپ کا کوئی نہ کوئی رشتہ رہا ہوگا'!' کیا آپ کو کوئی دوسرا موضوع نہیں ملتا؟''

جانور اور پرندے انسان سے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے انسان کا دماغ نہیں چاٹتے'' میں نے جواب دیا۔

'' کتے کاٹتے ہیں۔ سانپ ڈستے ہیں اور گدھا اپنی چونچ سے ٹھونگیں مارتے ہیں۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ صرف اتنا لکھا۔ مجھے

جانوروں سے گہرا لگاؤ ہے،'' اور پوچھا'' ۔تمہیں اتنے سارے خطوط لکھنے کی فرصت کیسے ملتی ہے؟۔

مجھے آپ کی کہانیوں سے تحریک ملتی ہے اور آپ کو خط لکھنے میں سکون ملتا ہے''۔

'' خط و کتابت اب بہت ہوئی، ہم ملاقات کرتے ہیں۔'' میں نے لکھا۔'' نہیں پہلے فون پر بات کرتے ہیں۔۔اپنی پیاری آواز کی کھنک سے میرے کانوں میں رس گھولیے یا کم سے کم پہلے اپنی تصویر بھیج دو''۔

جواب میں لکھا'' جو مزا ہجر میں ہے وہ وصل میں کہاں؟ ملاقات کے بعد محبت کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

ہمارے گھر پر ٹیلی فون نہیں ہے۔اگر فون ہوتا تو آپ سے آٹھوں پہر باتیں کرتی۔ میں اتنی بے حیا نہیں ہوں کہ کسی بیگانے کے گھر سے اپنے محبوب کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کروں۔تصویر دھوکا دیتی ہے۔کوئی بدصورت ہوتا ہے لیکن فوٹو میں اس کی تصویر اچھی نظر آتی ہے۔ میں فوٹو جینک نہیں ہوں تاہم میرے خدوخال جب ایک دن تم دیکھو گے تو مبہوت رہ جاؤ گے''۔

میں نے فوراً جواب دیا۔'' تم ملاقات نہیں کرنا چاہتی ہو اور نہ فون کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ جب تک اپنی تصویر نہیں بھیجو گی، میں تمہارے خط کا جواب نہیں دوں گا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ میں نے اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا۔

'' آپ نہیں مانو گے۔ میں ہاری، آپ جیتے۔لو تصویر ارسال کرتی ہوں۔ خط کے ساتھ مشمولہ چھوٹے سے لفافے کے اندر ہے''۔

چھوٹے لفافے کے اندر مونالیزا کی تصویر تھی ، میں غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور فوراً لکھا۔

'' تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے؟ میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ مونالیزا کی

تصویر کو نہ پہچانوں؟

ایک ہفتہ بعد مجھے اس کا لفافہ ملا میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔اس میں مدھو بالا کی تصویر تھی۔اس کے بعد ہمارے درمیان خط و کتابت ختم ہوگئی۔

اب تین دہائیوں کے بعد ایک رومانی خط موصول ہوا ہے۔جس میں نسوانی نام کی مکتوب نگار نے میری کہانی 'چوں چوں کا مربہ' کی تعریف کرتے ہوئے لکھا۔ ہے'' آپ کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے اور آپ کے رخسار اور ہونٹوں کا بوسہ لینے کو من مچلتا ہے۔''

پرانی یاد تازہ ہوگئی اور پرانا تجربہ اڑے آیا۔اس لئے خط کا جواب نہیں دیا، ایک ہفتہ بعد اس کرم فرما کا ایک اور خط ملا۔میری کہانیوں کو سراہا تھا۔، وہاں راز و نیاز کی باتیں بھی کی تھیں۔'' آپ کا افسانوی مجموعہ'' مینڈک کی واپسی'' پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ چند کہانیوں کو دو دو مرتبہ پڑھا۔اور مس چمگادڑ کی لاش، پڑھ کر ہونٹوں پر مسکان آئی اور آنکھوں میں آنسو آئے۔آپ نے چمکاڈروں کی دنیا کی حسینہ کو جلدی مروا دیا۔ایک دو سال زندہ رکھتے تو کیا فرق پڑتا۔وہ تو ہزاروں نوجوان چمکاڈروں کے دل کی دھڑکن تھی۔آپ بڑے سنگ دل ہیں۔کسی کے دل کے آبگینے کو اس طرح توڑا نہ کیجئے۔''

''غٹرغوں غٹرغوں'' اور'' کوا چلا ہنس کی چال'' بڑی پسند آئیں۔دونوں کہانیاں تین تین مرتبہ پڑھیں۔آپ کیا خوب لکھتے ہیں۔آپ کے قلم میں کیا جادو ہے؟ آپ کی کہانیوں نے مجھے آپ کا اتنا گرویدہ بنا لیا ہے کہ میں آپ کو پوجنے لگی ہوں۔آپ میری نس نس میں بسے ہیں، ہر لمحہ آپ کی یاد ستاتی ہے۔ کسی نے آپ سے پہلے مجھے پیار کا ایسا جذبہ نہیں دیا۔یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔آپ کی یاد میں مسکراتی ہوں۔ہنستی ہوں اور روتی ہوں۔کسی نے مجھے مسکرانا، ہنسنا اور رونا نہیں سکھایا۔آپ جب اپنے بستر پر روشنی بجھاتے ہیں تو یہ

سوچنا کہ میں آپ کو یاد کر رہی ہوتی ہوں۔''

میں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ البتہ میرے تحت الشعور میں ایک انجانی اور غیر مرئی خواہش اکسانے لگی۔ کہ میں اپنی کہانیوں غٹرغوں غٹرغوں اور کوا چلا ہنس کی چال، پڑھوں۔ چنانچہ دونوں کہانیاں پڑھ لیں۔

پھر یکے بعد دیگرے اس کرم فرما کے تین خط ملے۔ کہانیوں پر توصیفی تبصرے کے ساتھ پیار کا اظہار کیا تھا، تیسرے خط میں پوچھا تھا کہ غٹرغوں غٹروں کس پنچھی پکھیرو کی آواز ہے۔ کوا ہے یا کبوتر؟

جی چاہا کہ اس کو لکھوں کہ آپ نے کہانی پڑھی ہی نہیں ہے۔ اگر پڑھی بھی ہے تو اوپر اوپر سے پڑھی ہے اور سمجھے بغیر مجھے تعریف کی ہے۔ آپ دوبارہ کہانی پڑھیں پھر خیال آیا کہ اس نے مجھ سے جواب اخذ کرنے کے لئے یہ نکتہ ابھارا ہے۔ چنانچہ جواب لکھا۔

''محترمہ، کوا کائیں کائیں کرتا ہے۔ غٹرغوں غٹرغوں تو کبوتر کرتا ہے۔ کہانی سے واضح ہے آپ دوبارہ کہانی کو پڑھنے کی زحمت کریں. اب رہا آپ کے اظہار محبت کا۔ میں ستر سال کے پیٹے میں ہوں۔ میرے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں ہیں اور ان کی اولادیں بھی ہیں۔ اولاد کی بھی اولاد ہونے والی ہے۔

جواب میں لکھا تھا۔''ستر سال کے پیٹے میں ہو تو کیا ہوا؟ برنارڈ شاہ، کو اسی کے پیٹے میں بھی حسینائیں اظہار محبت کرتی تھیں۔ بوڑھا آئین سٹائین جب باہر نکلتے تو عورتیں اس کا پیچھا کرتی تھیں اور اصرار کرتی تھیں کہ ان کو اپنے عقد میں لیں۔ ہر عورت کو زندگی میں ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نے آپ کو اپنا رہبر بنایا ہے''

''میں نے لکھا'' آپ مجھے عالمی شہرت کی ہستیوں کی مثالیں دے کر ان

کے ذمرے میں شامل نہ کرے۔ مجھے تو اپنے شہر میں بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں''۔

آخر میں، میں نے لکھا'' آج موبائیل فون کا زمانہ ہے۔ سبھی فون پر باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو لمبی لمبی چھٹیاں لکھنے کی عادت کیسے پڑی ہے؟

جواب میں لکھا تھا، شریف لوگ فون پر بات نہیں کرتے، آپ نے طالبان کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ انہوں نے افغانستان میں اپنی حکومت کے دوران ریڈیو اسٹیشن میں کسی عورت کو اناونسر نہیں رکھا تھا کیونکہ نسوانی آواز جنسی خواہش کو ہوا دیتی ہے۔''

وہ ایسا نکتہ ابھار رہی تھی۔ کہ جواب دئے بغیر نہیں رہا گیا، لکھا۔'' آپ طالبان کی مثال دے کر دور کی کوڑی لائی ہو۔ اگر یہ بات مان لی بھی جائے تو کیا یہ مناسب ہے کہ ایک شریف عورت یا لڑکی ایک نامحرم مرد کو خط لکھے۔ اسے پہلے میں تمہارے خظ کا جواب دوں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنی ہوگی''۔

اس کے بعد بھی وہ باز نہیں آئی اور کئی خطوط لکھے۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ پھر قدرے لمبی مدت کے بعد اس کا خط آیا لکھا تھا۔

'' آپ بڑے ضدی ہیں۔ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔ مغرور ہیں۔ اکڑ کرنا کوئی آپ سے سیکھے، لیجئے فوٹو پیش خدمت ہے۔ لفافہ کے اندر ایک بند لفافہ تھا اسے کھولا تو اس میں سے اس بوڑھی بھکارن کی تصویر نکلی جو ہمارے شہر کے چوراہے پر اپنے سامنے کشکول رکھے یا رومال بچھائے رہتی ہے جس کی ناک سے سدا رینٹ ٹپکتی ہے اور منہ سے رال بہتی ہے۔

بھکارن کی تصویر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کوئی مجھے پھر سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

☆.....ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

گرہ

آنکھیں جل رہی تھیں ،سر درد سے پھٹا جا رہا تھا ، دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا،گرم سانسیں خود اپنے ہی رخساروں کو جھلسائے دے رہی تھیں اور سینے میں دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ایک گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن اس کی کیفیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔کبھی جی چاہتا،تاج پیلیس ہوٹل کی پانچویں منزل کے اس مہنگے ترین کمرے کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لے۔کبھی تمنا ہوتی ،زمیں پھٹ جائے اور اس میں سما جائے۔کبھی سوچتا کہیں بھاگ کر مفقود الخبر ہو جائے۔۔۔لیکن کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔کھڑکی کے شیشے کھل نہیں سکتے تھے، زمین کے پھٹ جانے کا تصور ہی مضحکہ خیز تھا اور فرار ہو کر جائے گا کہاں ! مفرور مجرم کی سزا تو دوچند ہو جاتی ہے اور بدنامی الگ۔

کل شام تک اس کی خوشی دیدنی تھی۔ہواؤں میں اڑ رہا تھا جیسے ہفت اقلیم کی شہنشاہی مل گئی ہو۔بات ہی ایسی تھی جس پیشہ ورانہ ترقی کا وعدہ اور یقین اس کے باس نے دلایا تھا،اتنی کم عمری میں اس کا مل جانا یقیناً ناقابل یقین تھا۔دل چاہ رہا تھا اسی وقت اڑ کر جائے اور ہما کو خوشخبری خود سنائے ،پھر اس کے چہرے پر بکھرتے دلآویز رنگ اپنے لبوں میں سمیٹ لے۔لیکن باس نے آج رات کے لئے اسے ایک بہت اہم ذمہ داری سونپی تھی جس کی بجا آوری کے لئے اسے ہوٹل میں ہی رکنا تھا۔

عاصم ایک مشہور امریکن سافٹ ویئر کمپنی کی بنگلور برانچ کا مینیجنگ ڈائریکٹر تھا۔ بڑی اور اہم پوسٹ تھی۔ اپنی انتھک محنت، جفاکشی، ایمانداری اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کمپنی کی شاخیں ملک کے کئی بڑے شہروں میں تھیں۔ کل ہی اس کا انگریز باس مائیکل ایڈیسن اپنی امریکن بیوی جینیفر کے ساتھ دہلی پہنچا تھا۔ ہندوستانی حکومت سے اس کمپنی کی کئی ہزار ملین ڈالر کی ایک ڈیل متوقع تھی جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔ شمالی اور جنوبی ہند میں کمپنی کے سربراہ اور برانچ ایم ڈی پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔ آج حکومت ہند کی متعلقہ وزارت کے عہدے داران اور مائیکل کی ٹیم کی میٹنگ کئی گھنٹے چلی۔ آج رات کمپنی کے امریکن مالکان سے ورچوئل کانفرنس کے بعد اس سودے پر منظوری کی مہر لگ جانے کی توقع تھی۔ مائیکل ایڈیسن اور مقامی عہدیداروں کو پوری امید تھی کہ ودیشی مالکان سے ہری جھنڈی ملتے ہی انہیں ایسی کامیابی ملے گی کہ وہ ہندوستان میں سافٹ ویئر کی دنیا کے بے تاج بادشاہ بن جائیں گے۔

کانفرنس کا وقت ہندوستان کے وقت کے مطابق رات دو بجے اور نیویارک میں دن کے تین بجے کے قریب طے ہوا تھا۔ مائیکل عاصم کو بہت پسند کرتا تھا۔ عاصم برابر ہیڈ آفس جاتا رہتا تھا۔ اس دوران دونوں میں ہم آہنگی اور بے تکلفی ہوگئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد دوسرے عہدیداران رخصت ہوکر اپنے اپنے ہوٹل جا چکے تھے لیکن عاصم کو مائیکل نے وہیں روک لیا تھا۔ دراصل مائیکل دن بھر کی مصروفیات سے بہت تھک گیا تھا اور چاہتا تھا کہ تھوڑی نیند لے لے تاکہ کانفرنس میں چاق و چوبند رہے۔ اس نے عاصم سے کہا۔

''عاصم، میں اور میری بیوی بہت گہری نیند سوتے ہیں۔ سر پر ڈرم بھی بج رہا ہو تو بھی ہماری نیند نہیں ٹوٹتی۔ کوئی الارم کام نہیں کرتا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ رات دو بجے مجھے جگا دو۔ میرے روم میں آکر مجھے جھنجھوڑو گے تب ہی میں جاگوں

گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اگر میں سوتا رہ گیا تو ہم سب کی قسمت بھی سو جائے گی۔''
عاصم نے ہکلاتے ہوئے کہا، ''لیکن سر آپ کی مسز آپ کے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے بیڈروم میں داخل ہونے کی جرات کیسے کرسکتا ہوں؟''

''اوہ ! فکر نہ کرو۔ آج رات ہم بہن بھائی کی طرح شرافت سے سوئیں گے۔'' مائیکل نے قہقہہ لگایا۔ ''میں دوسرے کمرے میں سو جاتا لیکن جینیفر بہت ڈرپوک ہے۔ رات کو تنہا نہیں رہ سکتی۔ تم یہ کارڈ رکھو۔ بے جھجک کمرے میں آ کر مجھے جگا سکتے ہو۔''

عاصم کوشش و پنج میں دیکھ کر وہ بولا، ''نو اف اینڈ بٹ (No if and but)

یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنی موت کو ٹالنا۔ ہم سب کی قسمت اسی پر منحصر ہے۔ میں صرف تم پر ہی اعتماد کرسکتا ہوں۔ تمہیں بھی اس کام کی اہمیت اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور جانتے ہو، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیل فائنل ہو جانے کے بعد میں مسٹر مورتی کو، جو جنوبی ہند کے انچارج ہیں، اپنی مدد کے لئے یو ایس لے جاؤں گا اور تمہارا تقرر ان کی جگہ کر دیا جائے گا۔''

عاصم کے ہاتھ سے سافٹ ڈرنک کا گلاس گرتے گرتے بچا۔ اس نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ مائیکل کا شکریہ کیا اور یقین دلایا کہ وہ رات دو بجے ہر حال میں اسے جگا دے گا۔

گزشتہ رات کی یہ ساری باتیں، سارے واقعات عاصم کے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے دماغ میں پوری گھن گرج کے ساتھ گونج رہے تھے، خون بن کر نازک رگوں میں ٹھوکریں مار رہے تھے۔

قریب تھا کہ ذہنی توازن بگڑ جاتا کہ وہ اٹھا اور کپڑوں سمیت ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ سر میں دہکتے ہوئے لاوے کو قدرے سکون ملا۔ بلیک کافی بنا کر پی اور فیصلہ کر لیا کہ علی الصبح وہ مائیکل کے

نام معافی نامہ اور اپنا استعفیٰ ہوٹل کے کاونٹر کلرک کے سپرد کر کے چلا جائے گا۔ جو ہو چکا اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

ہما کے ساتھ کسی چھوٹے شہر کی چھوٹی کمپنی میں معمولی سی نوکری کر کے زندگی گزار دے گا۔ ذہن کو یک گونہ سکون ملا اور وہ بستر پر دراز ہو گیا لیکن نیند کہاں! زندگی کے اوراق پلٹنے لگے اور وہ اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔ کچھ سنے ہوئے کچھ جھیلے ہوئے واقعات فلم کی طرح ذہن کے پروجیکٹر پر چلتے رہے۔

عاصم اتر پردیش کے ایک چھوٹے شہر کے متوسط اور مختصر خاندان میں پیدا ہوا۔ دادا پوسٹ آفس میں ملازم تھے اور والد ہاشم علی دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ ہاشم کو آبائی شہر کے کالج میں ہی ملازمت مل جائے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ البتہ دہلی کے ایک کالج میں عارضی لیکچرر مقرر ہو گئے۔ امید تھی کہ مستقل ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہاشم علی اور نورین چھ ماہ کے عاصم کو لے کر دہلی آ گئے۔ عاصم بڑا ضدی بچہ تھا۔

عموماً چھ ماہ کے بعد بچوں کو بوتل کے دودھ پر ڈال دیا جاتا ہے اور کچھ ہلکی بچوں کی غذا بھی شروع کر دی جاتی ہے لیکن عاصم نے ماں کے دودھ کے سوا کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ ڈبے کا دودھ زبردستی بوتل سے دیا جاتا تو الٹی کر دیتا۔ نورین سیدھی سادی محبت کرنے والی بیوی اور بیٹے پر جان چھڑکنے والی ماں تھی۔ سال بھر تک اپنا ہی دودھ پلاتی رہی۔ پھر وہ بیمار رہنے لگی۔ عاصم کا پیٹ نہیں بھرتا لیکن وہ بلی کے بچے کی طرح ماں کو چچوڑتا رہتا۔ ڈاکٹر نے سخت منع کیا تھا لیکن عاصم رو رو کر گھر بھر دیتا، کسی چیز کو منہ نہیں لگاتا۔ نورین کی مامتا بے قرار ہو جاتی اور وہ اسے سینے سے لگا لیتی۔ آخری دنوں میں وہ مجبور ہو گئی تھی۔ بیٹے کی ضد پوری نہیں کر سکتی تھی۔ کینسر پھیل چکا تھا۔ آپریشن کے باوجود دو سال کے عاصم کو روتا بلکتا چھوڑ کر دنیا سے رخصت

ہوگئی۔عاصم کو دادی نے سنبھالا۔مگر دادی بھی زیادہ دن تک ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔دادا اکیلے تھے۔نوکری کی وجہ سے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ادھر ہاشم کو بیٹے کی جدائی گوارا نہیں تھی۔نورین کو گزرے ہوئے برس بھی نہیں بیتا تھا کہ عفت نئی ماں کی شکل میں وارد ہوگئی۔عفت پرائے بچے کو ابھی اپنا بھی نہیں پائی تھی خود ماں بن گئی۔پرایا بچہ پرایا ہی رہا۔عاصم جب ننھی بہن کو ماں کے سینے سے لگ کر دودھ پیتے دیکھتا تو اس کے اندر کا وہ بچہ ہمکنے لگتا جو ماں کے سینے سے الگ ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔اسے گھورتا دیکھ کر عفت فوراً بچی کو آنچل میں چھپا لیتی اور اس کی پیٹھ پر دھموکا مار کر بڑبڑاتی،''کمبخت ماں کو کھا گیا،اب مجھے نظر لگا رہا ہے۔''

یہاں سے عاصم کی نفسیات میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔مار کھا کر بھی وہ یہ منظر چھپ چھپ کر دیکھنا چاہتا اور مزید مار کھاتا۔عاصم سات سال کا تھا،اسکول جانے لگا تھا۔لیکن عفت کا برتاؤ عاصم کے ساتھ ناروا ہی رہا۔گھر کا کام کرواتی اور دوپہر کو اپنے پاؤں دبواتی۔ایک دن عفت کے پاؤں دباتے ہوئے اس کی نظر اچانک عفت کے پیر کے انگوٹھے پر پڑی۔سفید،گلابی ناخون مدوری شکل کا انگوٹھا! عاصم کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور وہ بے ساختہ عفت کا انگوٹھا چوسنے لگا۔عفت کو نیند میں احساس ہوا تو جاگ گئی۔لات مار کر اسے نیچے پھینک دیا۔منہ سے مغلظات کا طوفان پھوٹ پڑا۔دو چار دھمو کے جڑ دیے۔شام کو ہاشم سے شکایت کر دی،''پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔تمہارا بیٹا بدمعاش بنے گا اول نمبر کا۔''

ہاشم نے بمشکل اس کا غصہ ٹھنڈا کیا عاصم کی گوش مالی کی۔بات آئی گئی ہوگئی۔لیکن حقیقتاً بات کہیں گئی نہیں بلکہ اور الجھ گئی۔

ایک آدھ سال گزرا۔ایک دن عاصم اور بہن روبی گھر کے سامنے پارک میں کھیل رہے تھے۔روبی اپنی گڑیا کو گود میں لیے جھولے پر بیٹھی تھی اور عاصم فٹ بال

سے کھیل رہا تھا۔ بال لڑھکتی ہوئی جھولے کے پاس چلی گئی۔ عاصم بال اٹھانے کے لئے جھکا تو نظر روبی کے ننھے منے پاؤں کے گلابی ناخن والے سفید انگوٹھے پر پڑی۔ اچانک دماغ میں وہی جھماکا سا ہوا جو اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیتا تھا۔ زمین پر بیٹھ کر وہ روبی کے پاؤں کا انگوٹھا چوسنے لگا۔ روبی بے ساختہ مچلی، اسے لات مارنے کی کوشش میں جھولے سے گر پڑی۔ ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ پڑوسی نے گود میں اٹھا کر گھر پہنچایا۔ ڈرا سہما عاصم بھی ساتھ تھا۔ عفت گھبرا گئی۔ ہونٹ پر برف لگائی، بچی کو چپ کروایا۔ عاصم اور روبی سے دریافت کیا کہ وہ کیسے گری۔ روبی نے سسکیوں کے درمیان سارا واقعہ سنایا۔ عفت کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ کان پکڑ کر عاصم کو اتنا مارا کہ خود ہی بے حال ہوگئی۔ ہاشم گھر آیا تو ہنگامہ برپا تھا۔ عفت نے الٹی میٹم دیا،

''اس لڑکے کو گھر سے نکالو ورنہ میں روبی کو لے کر میکے جارہی ہوں۔ اس بدمعاش کے ساتھ ایک پل نہیں رہ سکتی۔''

صبح ہوتے ہی عاصم ہمیشہ کے لئے دادا دادی کے پاس پہنچا دیا گیا۔

عاصم کی نفسیات میں گرہیں پڑتی رہیں۔ وہ خود کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے کیا ہوجاتا ہے۔

دادا نے اس کا داخلہ شہر کے سب سے اچھے مشنری اسکول میں کروادیا۔ یہ لڑکوں کا اسکول تھا۔ عاصم کی ذہانت میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا۔ ہمیشہ اول آنے والے عاصم نے نئے اسکول میں بھی اپنی ذہانت کی دھاک بٹھادی۔ اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم بن گیا۔ ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ کسی ٹیچر کے سفید پاؤں اور گلابی انگوٹھے پر نظر پڑی تو وہ کلاس سے نکل کر بھاگ گیا۔ سزا بھی ملی لیکن بڑی مصیبت سے بچ گیا۔

جیسے تیسے اسکولی تعلیم شاندار کامیابی کے ساتھ مکمل ہوئی۔ مقابلہ جاتی امتحان میں اول آیا اور بنگلور کے ایک مشہور انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہوگیا۔ اس کے

کلاس کی سب ہی لڑکیاں سانولی سلونی تھیں۔ خوبصورت تھیں لیکن اس کی نفسیات پر بھاری نہیں تھیں۔

بخیر و خوبی پانچ سال گزر ہی گیے۔ کالج placement میں ہی بنگلور کی ایک امریکی سافٹ ویئر کمپنی میں منتخب کرلیا گیا۔ ملازمت کے دوران کئی مرتبہ نفسیاتی گرہ نے اکسایا، لیکن اب وہ اتنا باشعور ہو چکا تھا کہ ایسے کسی موقعے پر آفس سے باہر نکل جاتا۔ کچھ ہی برسوں میں اس کی ذہانت، سمجھ بوجھ، لگن، محنت اور صلاحیت سے متاثر ہوکر اس کے امریکہ مقیم باس مائیکل ایڈیسن نے اسے برانچ مینیجر بنا دیا۔ اس عہدے پر فائز ہوتے ہی پہلا حکم یہ جاری ہوا کہ اسٹاف ممبر موزے جوتے پہن کر ائیں۔ آفیس میں یونیفارم پہلے ہی سے تھی چنانچہ اس حکم کے نافذ ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اب عاصم قدرے مطمئن ہوگیا تھا، ذہنی جھماکوں سے بڑی حد تک راحت مل گئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ رات کا واقعہ ہوگیا۔

رات دو بجے وہ مائیکل کے کمرے میں داخل ہوا۔ خودکار دروازہ بند ہو چکا تھا۔ مائیکل کا بستر خالی تھا۔ عاصم نے آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اچانک نظر سوئی ہوئی جینیفر پر پڑی جس کا ایک پاؤں کمبل سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سفید پاؤں، مدوری انگوٹھا، گلابی ناخون! عاصم کے دماغ میں ایسے شدید جھماکے ہوئے کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ بیڈ کے پاس قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ بے تابانہ جینیفر کے پاؤں پر جھک گیا۔ انگوٹھا اس کے ہونٹوں میں تھا، آنکھیں بند تھیں۔ اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھول کر مائیکل باہر آیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر پہلے تو چونکا پھر عاصم پر گالیوں کی بوچھار کردی۔ عاصم جیسے ہوش میں آ گیا۔ جینیفر بھی جاگ گئی تھی اور بڑی کراہیت سے اپنے گیلے انگوٹھے کو دیکھ رہی تھی۔ مائیکل پوری طاقت سے چلایا، ''گیٹ آوٹ

آف مائی روم، یو باسٹرڈ۔''

عاصم کی نسوں میں خون منجمد ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں شل ہوگیے۔دماغ جھائیں جھائیں کررہا تھا۔مائیکل نے کالر پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے۔عاصم نے کاغذوں کے ڈھیر برباد کرنے کے بعد مائیکل کے نام دو خط لکھے۔ایک معافی نامہ جس میں مختصراً اپنی بچپن کی بیماری کا ذکر کیا ،اور دوسرا ملازمت سے اپنا استعفیٰ۔دوا لگ الگ لفافوں میں بند کیے،اپنا بیگ اٹھایا اور شدید ڈیپریشن کے عالم میں لفٹ میں داخل ہوا۔اسے یقین تھا کہ اس وقت ریسیپشن ہال میں کوئی جانکار نہیں ہوگا۔کلرک کو مائیکل کے لئے دونوں لفافے دے کر چمک دمک کی اس دنیا سے دور چلا جائے گا۔لیکن جیسے ہی لفٹ سے باہر نکلا اس کے قدم پتھر ہوگیے۔سامنے ہی مائیکل شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔گلاس ہاتھ میں تھا ،ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے ہی عاصم پر نظر پڑی اور وہ زور سے چلایا،

''او عاصم، مائی فرینڈ!

Come let's celebrate!"

عاصم ہکا بکا رہ گیا۔ہاتھ سے دونوں لفافے گر گئے۔مائیکل نے دوبارہ آواز دی تو مرے مرے قدموں سے آگے بڑھا۔مائیکل دو قدم آگے بڑھا کر اس کے پاس پہنچ گیا۔عاصم کے ہاتھ پاؤں برف ہورہے تھے۔نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ مائیکل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا،

Come on man,cheer up!

مسٹر ولسن نے منظوری دیدی ہے۔اب یہ ڈیل ہماری جھولی میں ہے۔اس شاندار کامیابی میں تم بھی شامل ہو۔''

وہ بہت پر جوش تھا۔

عاصم نے کانپتے ہاتھوں سے دونوں لفافے آگے بڑھا دیے۔

''کیا ہے یہ؟'' مائیکل نے لفافے چاک کیے، خط پڑھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے دونوں خط پھاڑ کر شراب کے جام میں ڈال دیے۔ اسے اپنے پاس بٹھایا۔ عاصم کے لب سل گیے تھے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکلا۔

مائیکل بولا ''رات جو میرا برتاؤ تھا وہ قطعی اضطراری تھا، کیونکہ جو میں نے دیکھا اس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ میں کچھ اور سمجھا تھا۔ حالانکہ میں فوراً ہی سنبھل گیا تھا لیکن وقت نہیں تھا۔ کانفرینس کے لئے لاگ ان کرنا تھا۔'' میرے دوست، میں ناراض نہیں ہوں کیونکہ میں خود اس نفسیاتی علت میں گرفتار رہ چکا ہوں ۔کوئی بیماری نہیں ہے، ایک لاشعوری گرہ ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے Oral fixation کہتے ہیں۔ وجہ الگ الگ بھی ہوسکتی ہے، کوئی محرومی، کوئی دبی کچلی خواہش، خصوصاً بچپن میں ذہنی نا آسودگی کی اسٹیج پر انسان ٹھہر سا جاتا ہے۔ جو حرکت سرزد ہوتی ہے اس میں اس کے شعور کا دخل نہیں ہوتا۔ اکثر کسی شدید جھٹکے (شاک) یا غیر متوقع رد عمل سے یہ علت دور بھی ہوسکتی ہے۔''

اتنے میں سامنے سے جینیفر آتی دکھائی دی۔ اس نے سیاہ سینڈل پہن رکھے تھے۔ مائیکل نے کہا، ''عاصم، جینیفر کے پاؤں کو دیکھو، اس کے انگوٹھے کو دیکھو۔''

عاصم سفید پڑ گیا۔ مائیکل کے اصرار پر ڈرتے جھجکتے جینیفر کے پاؤں پر نظر ڈالی۔

ایک عام سا انگوٹھا، سفید، موٹا، گلابی نیل پالش سے رنگے ناخون! کوئی دلکشی نہیں، کوئی غیر معمولی حسن نہیں، کوئی جھما کا نہیں ہوا، کوئی شیطان نہیں جاگا۔ گرہ کھل چکی تھی۔

عاصم کے چہرے پر بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھلی کھلی مسکراہٹ تھی اور ایک گرم جوش نظر جو مائیکل کے لئے تھی۔

☆☆☆

☆.....بلراج بخشی

چور

ادھ کھلے دروازے کو میں نے دھکا دیا تو وہ پورا کھل گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر لاکھ لاکھ کی دو گڈیوں پر پڑی جو بیڈ کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی سے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کوئی نہیں تھا۔ اچانک واش رُوم سے فلش کی آواز آئی۔ عین اسی وقت بے اختیار ہی میرے ہاتھ لپکے اور اگلے ہی لمحے لاکھ لاکھ کی دونوں گڈیاں میری جیبوں میں منتقل ہوگئیں۔ پھر پلک جھپکتے ہی میں نے خود کو کمرے کے باہر پایا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے کمرے میں کیسے پہنچا لیکن کمرے میں آکر مجھے احساس ہوا کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں تر تھا اور ہانپ رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے عجلت میں اپنا سوٹ کیس کھولا اور نوٹوں کی دونوں گڈیاں کپڑوں کے درمیان کہیں رکھ کر سوٹ کیس لاک کر دیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھا، ریفریجریٹر سے وہسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور گلاس میں ایک بڑا پیگ بنا کر ایک ہی سانس میں ختم کر کے دوسرا پیگ بنایا اور میز پر رکھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لیا۔ میں نے دیکھا کہ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ پیگ میں سوڈا کم تھا۔ تیز وہسکی نے چند ثانیوں کے اندر ہی رگ و پے میں گرمی دوڑا دی۔ میں معمول پر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں آج تک حیران ہوں کہ یہ سب اتنی سرعت سے کیسے ہو گیا۔ یہ اتنی جلدی اور اتنا اچانک ہوا تھا کہ اس میں ارادے کا کوئی دخل تھا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میری لاشعوری ساخت ہی ایسی ہو گی۔ دراصل میں اوسط درجے کا ایک ضدی قسم کا آدمی ہوں جو محض اپنی محنت اور لگن سے منتہائے مقصود حاصل کر لیتا ہے۔ عمومی طور پر آپ مجھے ایماندار بھی کہہ سکتے ہیں اور قدرے بے ایمان بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو نیچے گرے ہوئے کسی کے دس روپے تو اٹھا کر اسے ایماندارانہ مسکراہٹ کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں لیکن نوٹ اگر ہزار پانچ سو کا ہو تو پھر ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ آپ نے کئی لوگ دیکھے ہوں گے جو مونگ پھلی کا گرا ہوا دانہ تو نہیں اٹھاتے پر اگر بادام یا کاجُو کا دانہ گر جائے تو آنکھ بچا کر اسے اٹھانے اور دھو کر کھا لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بس آپ مجھے اسی قسم کے لوگوں میں سے سمجھ سکتے ہیں جو پانی کے گلاس میں گری ہوئی مکھی کو دیکھ کر سارا پانی پھینک دیتے ہیں اور مکھی اگر دودھ میں گری ہو تو مکھی کے ساتھ تھوڑا سا دودھ گرا کر باقی دودھ پی جاتے ہیں۔

دوسرا پیگ بھی چسکیوں میں ختم کر کے میں تیسرا بنانے ہی لگا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی اور میں چونک گیا۔

'آ جاؤ...دروازہ کھلا ہے...' میں نے پھنسی پھنسی سی اونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا تو میرا دوست اندر آ کر وہسکی کی بوتل اور گلاس کا جائزہ لینے لگا۔

'کھانے کے بعد وہسکی؟' اس نے کہا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

'بس یوں ہی...دو لاکھ بونس کی خوشی میں...' میں نے تھوک نگل کر کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے چہرے کا رنگ بھی فق تھا۔

'کیا بات ہے... پریشان لگ رہے ہو...' میں نے بہ مشکل کہا۔

'میرے دو لاکھ روپے غائب ہو گئے...'

'کیا مطلب؟' اسے کہیں مجھ پہ شک تو نہیں ہو گیا، میں نے سوچا۔

'دو لاکھ... جو مجھے اور تمہیں ملے تھے... میرے کمرے سے غائب ہو گئے...'

'غائب ہو گئے؟... کیسے؟... کہیں رکھ کر بھول تو نہیں گئے...' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

'نہیں... بھولنے کا سوال ہی نہیں... میں نے کمرے میں رکھے تھے...'

'پھر کہاں چلے گئے؟'

'یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...'

'کمرے میں سے کیسے غائب ہو سکتے ہیں؟' اب میرے لہجے میں ہمواری عود کر آئی تھی اور میں پرسکون ہو گیا تھا۔

اس نے دونوں ہونٹ سکوڑے اور سر ہلا کر بے بسی ظاہر کی۔ پھر وہ دو قدم چل کر صوفے پر بیٹھا اور بڑی دیر تک خاموش رہا۔ میں اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

'پیو گے؟' میں نے وہسکی کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

'سیمینار ہال سے میں تمہارے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا...' وہ تھوڑی دیر بعد پُرتفکر انداز میں بولا '...تم اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں... مجھے کچھ حاجت محسوس ہو رہی تھی... میں نے جیب سے دونوں گڈیاں نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھیں... اور... واش روم چلا گیا... اب سوچتا ہوں کہ شاید میں نے دروازہ ہی بند نہیں کیا...'

'لیکن کسی کو کیا پتہ کہ تم نے دروازہ بند نہیں کیا؟'

'کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ... کہ کیا کروں...' وہ پیشانی رگڑتا ہوا بولا۔

اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

'اس صورت میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے...' میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا

'...فوراً ہوٹیل مینیجمنٹ کو رپورٹ کرنی چاہیے... اٹھو...'

پولیس آئی، کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا اور ہمارے بیان لے کر چلی گئی۔

ہم دونوں ایک ملٹی نیشنل انشورنش کمپنی میں ائریا مینیجر ہیں اور کمپنی کی میٹنگوں میں اکثر ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اس بار کی میٹنگ میں ہماری بہتر کارکردگی کی بنا پر ہم دونوں کو دو دو لاکھ روپوں کا بونس دیا گیا۔ شہر کے اس تین ستارہ ہوٹل میں ایک ہفتے کے لیے ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا اور آج دوسرا دن تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کمپنی کی ائر کنڈیشنڈ منی بس آئے گی اور میٹنگ میں حصہ لینے والے ایجنٹوں کو لے کر قابلِ دید مقامات کی سیر کو لے جائے گی۔ دو دن تک یہی معمول رہا۔ میرے ساتھی پر اضمحلال طاری رہنا فطری تھا مگر میں مگن ہی رہا۔

تیسرے دن پولیس نے تھانے میں بلایا۔ انہوں نے ہوٹل کے ایک روم بوائے کو حراست میں لیا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ یہ بیس بائیس سال کا ایک مفلوک الحال نوجوان تھا جس کے ہونٹوں کی بائیں جانب سے خون رِس رہا تھا اور اوپری ہونٹ پر ناک سے نکلنے والا خون جم گیا تھا۔ پولیس افسر نے اسے مرغا بننے کا حکم دیا اور پھر جب وہ جھکا تو ایک سپاہی نے چمڑے کی ایک موٹی لمبی پٹی کو تیزی سے دو بار پے در پے لہرا کر اس کے کولہوں پر زور سے دے مارا۔ چٹاخ چٹاخ کی آوازیں ہوئیں اور وہ درد سے بلبلا کر چیخ پڑا۔ چمڑے کی پٹی پر لکھا ہوا تھا 'آن ملو سجنا'۔

میں نے کراہت سے منہ موڑ لیا۔ ایک تو میں فطرتاً کچھ نرم دل واقع ہوا ہوں

اور پھر یہ تو اسے ایسی اذیّت دی جا رہی تھی جس کا ذمہ دار میں تھا اور جس کا وہ مستحق ہی نہیں تھا۔ میں نے خود پر نفرین بھیجی اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد میرا دوست بھی باہر آ گیا۔

'تم کیوں چلے آئے تھے؟' اس نے پوچھا۔

'بس یوں ہی... مجھے اچھا نہیں لگا...' میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔'...کیا کہہ رہے تھے پولیس والے؟'

'کہہ رہے تھے کہ...اتنا مارا...پھر بھی جرم قبول ہی نہیں کر رہا ہے...'

'کیا تمہیں لگتا ہے کہ اس نے چوری کی ہوگی؟' میں نے تیز لہجے میں کہا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

'میں کیا کہہ سکتا ہوں... پولیس تفتیش کر رہی ہے...' اس نے بالآخر کہا۔

'خاک تفتیش کر رہی ہے ...اگر تفتیش کر رہی ہے تو ہمیں کیوں بلایا تھا... تفتیش پوری کر کے بلاتے!' میرا لہجہ غصیلا تھا۔

'میں نہیں سمجھا...'

'انہوں نے ہمیں یہ تسلی دینے کے لیے بلایا...کہ دیکھو ہم کتنی تندہی سے تفتیش کر رہے ہیں...' میں نے طیش میں آ کر کہا'...اور ہمارے سامنے اسے پیٹنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم مطمئن ہو جائیں اور کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کریں...'

'ہوسکتا ہے...'اس نے بے دلی سے کہا۔

'میرا دعویٰ ہے کہ وہ بے قصور ہے...' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

'یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟' اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور میں گڑبڑا گیا۔

'بس ...میرا دل نہیں مانتا...' میں نے قدرے توقف سے کہا۔

مجھ پر احساس گناہ مسلّط ہونے لگا۔ پتہ نہیں پولیس اس پر مزید کتنا تشدد کرے گی، میں نے سوچا اور میرے منہ کا ذائقہ کسیلا ہو گیا۔ میرے خواب میں بھی نہیں تھا کہ میری کسی حرکت سے کوئی بے گناہ خواہ مخواہ پھنس جائے گا۔ میری طبعیت پراگندہ ہو گئی۔ اگلے تین دن میں بدستور کبیدہ خاطر رہا۔ تیسرے دن پولیس نے اطلاع دی کہ ملزم کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی پر کچھ برامد نہ ہو سکا۔ لہٰذا کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے ملزم کو ذاتی مچلکے پر چھوڑ دیا گیا۔ رپورٹ تو لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

'مجھے پہلے ہی پتہ تھا...' میرے دوست نے مایوسی سے کہا '...ایک لاکھ پولیس کھا گئی ہو گی...کیس ختم... '

میں خاموش رہنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

اگلے روز ہم سب کی واپسی تھی۔ میرے دوست کی فلائیٹ صبح دس بجے تھی اور میری دوپہر کے بعد دو بجے۔ میں بارہ بجے ریسیپشن پہ آیا اور کاؤنٹر کلرک کے پاس یہ کہہ کر سوٹ کیس رکھا کہ میں دو ایک گھنٹے میں اسے لینے واپس آ جاؤں گا۔ پھر میں نے اس روم بوائے کا پتہ پوچھ کر ہوٹل سے چیک آؤٹ کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں روم بوائے کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا پھر میرے پیچھے دیکھنے لگا۔

'گھبراؤ نہیں...' میں نے مسکرا کر کہا '...میں اکیلا ہی آیا ہوں...'

وہ ویسے ہی کھڑا رہا۔

'کہیے...' اس کا لہجہ سرد تھا۔

'اندر آنے کو نہیں کہو گے؟' میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وہ ہچکچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

'میرے ساتھ بڑا ظُلم ہوا صاحب ...میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے چوری نہیں کی...' اس کا گلا اچانک بھر آیا۔

'میں جانتا ہوں... 'میں نے اسے دلاسا دیا۔

'آپ جانتے ہیں؟' اس کی آنکھوں میں تذبذب کے آثار ابھر آئے۔

'ہاں...اور چور کو بھی جانتا ہوں ...' میں مسکرایا۔

'کیا مطلب...'

'اصل میں ... چوری...میں نے کی تھی...اور میرے جرم کے لیے ...تم نے پولیس کی مار کھائی...'

اس کا منہ کھُل گیا۔

'اس لیے ...قاعدے سے ...مالِ مسروقہ میں تمہارا بھی حصہ بنتا ہے...' میرے ہونٹوں پہ اداس سا تبسم ابھر آیا۔

وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

'تم شاید مجھے ...ایماندار نہ کہو...لیکن میں...اتنا...بے ایمان بھی نہیں ہوں ...' میں نے آہستہ سے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لاکھ کی گڈی نکالی۔

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک چھوٹی سی تپائی پر گڈی رکھی اور اس کی طرف دیکھے بغیر مڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

☆..... راجہ یوسف

کلونت کور کی واپسی

'' ارے واہ.....میری بلورانی آج کل کیا پڑھ رہی ہے۔ ''

'' تیرے کام کی چیز نہیں ہے دیدی.....رہنے دو ''

'' پھر بھی تو دکھاؤ کیا ہے ۔'' بڑی بہن شفق نے کتاب ہاتھ سے چھین لی اور دیکھتے ہی نیچے پھینک دی۔''

''ارے یہ.....چھی چھی چھی.....پھر سعادت حسن منٹو..... یہ کیا پڑھتی ہو بلورین؟''

'' اوہو شفق دیدی۔۔۔ بتایا تھا نا تیرے مزاج کی چیز نہیں ہے ۔''

''کتنی بار کہا اسے مت پڑھا کر۔اس کو پھر پڑھا تو امی کو بتا دوں گی۔''

بلورین اپنی معصوم بہن شفق کو یاد کرتے ہی رو پڑی۔شفق شادی کے بعد صرف پندرہ دن زندہ رہی۔اس کی موت سے سارے علاقے میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔لوگوں میں اس کے شوہر گاما کے لئے نفرت تھی۔انہیں شفق کی بے وقت موت نے دکھی کر دیا تھا۔کھرچنا، پھاڑنا، اتارنا گاما کا شیوہ تھا جو اس کے پنجے میں پھنس جاتی تھی جیسے چیل کے پنجے میں چوزہ۔تڑپتی پھڑپھڑاتی رہ جاتی تھی۔یا جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھی۔گاما پڑوس کی بستی کا بدمست غنڈہ۔اصل نام گلاب چند۔خصلت ببول جیسی۔نہ عقل کا نہ شکل کا۔بس سانڈ جیسے قد کاٹھ کا۔جاہل اتنا کہ کوئی قریب نہ پھٹکتا۔سرکش اتنا کہ حاکم بھی سر پر ہاتھ رکھ کر فخر کرے۔شریف اسے دور بھاگتے تو نیتا

اسے سر پہ بٹھاتے۔ بے وجہ لڑائی جھگڑے میں پڑنا، کبڈی کھیلنا اس کے خاص مشغلے۔ کبڈی میں اتنا پھرتیلا کہ سامنے والوں کو خاک چٹائے۔ اگلی ٹیم کے دو دو بندے ہاتھوں میں اٹھا کر لائے اور اپنی بونڈری میں پٹک دے۔ تماشہ گیر گاما گاما چلاتے تو لوگ اصل نام گلاب چند بھول گئے اور یہ گاما پہلوان ہو کر رہ گیا۔ غرور گھمنڈ میں اندھا اتنا کہ ماں بہن کا کوئی لحاظ نہیں۔ بدمذاق چمچوں کی ٹولی میں خود کو راجہ سمجھتا۔ اس کے چمچے اس کی راہ میں کیلے کے چھلکے اور زبانی خرچ والی مکھن کی چکنائی سے پھسلن بنانے کا ہنر جانتے تھے اور گاما کو پھسلنے میں مزا آتا تھا۔ پہلے پہل نشہ کر کے سیدھا کوٹھے پہنچتا۔ ٹولی کے ایک بدخواہ نے راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے کی ترغیب دی۔ اس کام کو کرنے میں اتنا مزا آیا کہ اپنا مشغلہ ہی بنا دیا۔ کسی بھی باکرہ کو اٹھا لینا اور دو چار دن کے بعد واپس پھینکنا اس کا معمول بن گیا۔ آس پاس کے لوگ اتنے پریشان کہ بستی چھوڑ کے جانے کو تیار۔ کہاں کہاں گاما کی شکایت نہ لگائی۔ پولیس کے پاس گئے۔ اعلیٰ حاکموں کے در کھٹکھٹائے۔ لیکن کہیں بھی سنوائی نہ ہوئی۔ الٹا شکایت کرنے والوں کو سزا بھگتنی پڑتی۔ خوف سے کوئی سر نہیں اٹھاتا تھا۔۔۔

عمر چالیس بیالیس کو آئی تو شادی کرنے کا شوق چرایا۔ اس کے سارے ہرکارے اچھی لڑکی کی تلاش میں نکل پڑے۔ کئی بستیاں چھان ماری۔ گھر کھنگالے۔ لڑکیاں دیکھی۔ لیکن کسی پر گاما کا دل نہیں بیٹھا۔ ایک دن راہ چلتے شفق اور رلبورین کو دیکھا۔ دونوں خوبصورت تھیں۔ شفق کا بھولا پن اور بلورین کا چنچلا پن من کو بھا گیا۔ ایک موالی کو ان کی ماں راحیلہ باجی کے گھر بھیجا۔ شفق اور بلورین نے کھری کھری سنائی۔ راحیلہ باجی نے موالی کو دھتکار کر گھر سے نکالا۔ اسی شام کو گاما نے ہلہ بول دیا۔ شفق کو اٹھا کر لے گیا۔ پوری بستی میں ہاہا کار مچی۔ کوئی گاما کے پاس جانے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے اس کی ذات کے کچھ لوگ تیار ہو گئے۔ وہ

بھی جیسے اپنے سر پر کفن باندھے نکلے تھے۔ ڈرے سہمے پڑوسی گاما کے گھر پہنچے۔اس کے بھائیوں بھابیوں کے پیر پکڑ لئے۔لیکن وہ بھی گاما کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد آخر مجبور ہوکر وہ بستی والوں کے ساتھ گاما کے پاس چلے گئے۔گاما نے لڑکی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑنے کی بات تو مان لی۔لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ لی کہ وہ لوگ شفق کو اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار کریں۔ لوگوں نے منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ مذہبی بھائی چارے کی دہائی دی لیکن وہ ایک بات بھی نہ مانا۔مرغے کی ایک ٹانگ۔

''میں لڑکی کو ایسے ہی بنا کچھ کئے اس شرط پر چھوڑ رہا ہوں کہ یہ میری بیوی بنے۔ میں کسی اور کے لئے تھوڑی اس کو پوتر چھوڑ دوں گا۔ اس کو اگر لے جانا ہے تو یہ سوچ کے لے جاؤ کہ اس کو میری ہی بیوی بننا ہے۔''

بستی کے لوگ شفق کو لے کر آ تو گئے تھے لیکن کسی کو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ معاملہ کیسے سلجھائیں۔ جب راحیلہ باجی نے یہ سنا تو جیسے آسمان اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ اسے جب کوئی راستہ نہ سوجھا تو اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ دونوں بیٹیوں کو زہر دے کر وہ بھی خودکشی کر لے گی۔۔۔لیکن گاما نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔صبح ہی شادی کا سارا سامان لے کر گھر آ گیا جس میں کپڑے، مہندی، کچھ سونے کے زیورات تھے اور شام تک شادی کی پوری تیاری کرنے کا آدیش دے دیا۔ساتھ ہی ساری بستی میں اعلان کر دیا۔

'' اگر تم اپنی بہو بیٹیوں کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہو تو شفق کو میری دلہن بنانے میں مدد کرو۔ ساری بستی کا کھانا آج میری طرف سے، اس لئے بے فکر ہو کر میری شادی میں شریک ہو جاؤ۔ شادی کے لئے چاہے پنڈت کو بلاؤ یا مولوی کو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی میں دونوں کو نہیں مانتا ہوں۔بس یہ تم ذی عزت بستی والوں کے لئے کر

رہا ہوں۔اپنی بہو بیٹیوں کو یہاں بلاؤ۔دلہن کو تیار کرو۔اور ہاں اپنی بیٹیوں سے کہہ دو میری دلہن کو سجانے سنوارنے میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ابھی میں سدھرا نہیں ہوں ہاااں.....''

شفق دلہن بنی اپنی سہیلوں میں گھری تھی۔کوئی اسے ابٹن لگا رہی تھی تو کوئی مہندی۔کوئی اس کے ماتھے کو چھوٹے جھومر سے سجا رہی تھی تو کوئی ہاتھوں میں چوڑیاں پہنا رہی تھیں۔کچھ اس کے کپڑے پریس کر رہی تھیں۔تو دو تین لڑکیاں اس کے بال بنا رہی تھیں۔حالانکہ گھر کے اندر باہر گہما گہمی تھی۔لیکن کسی کے بھی چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔شفق کا چہرا اترا ہوا تھا۔اس کی کسی بھی سہیلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔شفق کی چھوٹی بہن بلورین غصے سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

اس شادی سے بس گاما اور اس کے دوست ہی خوش تھے اور ناچے بھی وہی لوگ تھے۔گاما کے گھر والوں میں بھی کوئی خوش نہیں لگ رہا تھا۔اور نہ وہ اس شادی میں شریک ہوئے تھے.....لیکن شادی کے بعد صرف پندرہ دن میں شفق مر گئی تھی۔

شفق اور بلوریں جب کالج جانے لگیں تھیں تو راحیلہ باجی کے ساتھ ساتھ پوری بستی خوش تھی۔دونوں بہنیں پڑوسیوں کی چہیتی تھیں۔ شفق خوبصورت تھی لیکن سیدھی سادی اور شریف بھی بہت تھی۔پوری بستی میں اس کی اچھائیوں کا ذکر ہوتا تھا۔جبکہ بلورین بہت تیز اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔کسی کو بھی سامنے جواب دے دیتی تھی۔لیکن وہ پڑوس کی تمام عورتوں کے کام بھی آتی تھی۔کسی کو بازار سے کوئی ذاتی سامان لانا ہوتا تو اسی سے ہی منگواتی تھیں۔مائیں اپنی بیٹیوں کو مشکل اوقات میں انہی دو بہنوں کے پاس بھیجتی تھیں۔تاکہ وہ انہیں سنبھال لیں۔اور وہ دونوں بہنیں نرسوں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔

بلورین ناول، کہانیاں اور افسانوں کی دلدادہ تھی۔خاص کر وہ منٹو کی کہانیوں کی دیوانی تھی۔اسے منٹو کے افسانوں کے کئی کردار اپنی ذات کا حصہ لگتے تھے۔ایسے کئے

کردار تھے جو اسے اپنی نس نس میں اتارنے کا دل چاہتا تھا۔

شفق کی موت کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ بلورین کے لئے گاما کا پیغام آ گیا۔ اب تو پورا محلّہ ہی بپھر گیا تھا۔ گاما کی کومنٹی کے لوگوں کو بھی غصہ آ رہا تھا۔ لیکن سب ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ اور گاما بلورین کو لے گیا۔ بلورین مٹھّیاں بینچ رہی تھیں۔ وہ منٹو کے ایک ایک کردار کو یاد کر کے جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

''اری سنو تو ثمرہ۔ گاما تھا ہی سانڈ جیسا آدمی۔ اسی کی طرح وحشی بھی۔ پہلی رات کو میں اس سے ڈر جاتی۔ لیکن میں من بنا چکی تھی وہ ہارا ہوا ایشر سنگھ ہے اور میں بڑے دھڑ لے والی کلونت کور۔''

'' پھینک پتے ..... پتے پھینک ..... اور پھینک.....'' ایک رات گئی، دوسری، تیسری رات تک اس کی ساری اتر گئی تھی۔ اور چوتھی رات وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ شاید کسی حکیم وید سے مل کر آیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف صاف جھلکتا تھا۔ کئی داؤ آزمائے۔ کلونت کور کے سامنے اس کے سارے داؤ ٹوٹکے پھس ہو گئے۔ وہ بے حد ڈرا اور سہا ہوا تھا۔ کلونت کور تیزی سے چیخی۔

''ایشر سائیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک'' کلونت کور نے اسے پرے پھینک دیا اور دھتکار کر بھگا دیا.....تھووووو ''

پانچویں صبح، ابھی بستی کی لڑکیوں کے ہونٹ سلے ہی تھے۔ ابھی لڑکوں کے دلوں میں گاما کا ڈر بیٹھا ہوا ہی تھا۔ ابھی بزرگ مرد عورتیں افسوس کے ساتھ ہاتھ ہی مل رہے تھے کہ شادی کی پانچویں صبح بستی میں اچانک بھنبھناہٹ سی پھیل گئی۔ سبھی لوگ ایک ایک کر کے گھروں سے باہر آ گئے۔ کچھ لوگ دوسری بستی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھ رہا تھا کیا ہوا۔ دوڑتے دوڑتے لوگوں کی بھیڑ گاما کے آنگن میں جمع ہو گئی، اب وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کیا ہو گیا، سب کو ایک ہی بات کا

خدشہ تھا کہ اب وہ بلورین کی لاش دیکھیں گے۔ سبھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔

''کیا ہوا'' اور دوسرا آنگن کے بڑے پیڑ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ جو بھی اس طرف دیکھتا تھا۔ ہکا بکا ہو کر رہ جاتا تھا۔ آناً فاناً بات چار سو پھیل گئی۔ بستی میں پولیس پہنچ گئی۔ پنچ سرپنچ سب جمع تھے۔ پولیس نے پیڑ سے گاما کی لٹکتی لاش اتار دی۔ پولیس کے لئے معاملہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھا، خودکشی کے سارے ثبوت صاف تھے۔ گاما نے پیڑ کی جس شاخ کو خودکشی کے لئے منتخب کیا تھا وہ شاخ اس چھپر کی عین سیدھ میں تھی جس کے نیچے جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا تھا۔ اسی چھپر پر چڑھ کر گاما نے رسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ چھپر کے پاس ہی اس کی چپل کا ایک پیر سیدھا اور ایک الٹا پڑا تھا۔ پولیس نے پنچوں اور سرپنچ کے دستخط، انگوٹھے لئے۔ اور فائل بند کر کے بغل میں دبا دی۔ لاش کے وارثوں کو بلایا گیا۔ کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا۔ کوئی موالی مشٹنڈا بھی نہیں آیا۔ پولیس نے کچھ منت سماجت کر کے اور کچھ ڈرا دھمکا کر گاما کی لاش اس کے بھائیوں کے سپرد کر دی۔

کئی دنوں کی گہما گہمی کے بعد آج راحیلہ باجی کے گھر میں تھوڑی خاموشی تھی۔ بلورین کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ ماں نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ بلورین کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جب جاگی تو اس کی خاص سہیلی ثمرہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سرہانے رکھی کتاب ثمرہ نے اٹھالی۔

کتاب وہیں کھل گئی جہاں کے ورق فولڈ کئے ہوئے تھے۔ کلونت کور'' سن ثمرہ..... پانچویں رات گاما آیا ہی نہیں۔ مجھے فیصلے کا انتظار تھا۔۔۔ اور فیصلہ ہو بھی چکا تھا۔'' بلورین کتاب کے اس پنے پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھر رہی تھیں جہاں کلونت کور تھی۔

☆☆☆

ڈراما

☆.....نورشاہ

ادھورا ناول

(پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

۔۔۔۔کاغذات بکھیرنے کی سرسراہٹ۔۔۔

نجمہ: (دور سے) فریدؔ

فرید: کیا ہے بی بی جی

نجمہ: (نزدیک آ کر) کیا کر رہے ہو۔

فرید: شلف میں کتابیں قرینے سے رکھ رہا ہوں، بالکل بے ترتیب پڑی ہیں۔

نجمہ: تمھیں کمال بھیا بُلا رہے ہیں، کوئی کام ہوگا، تم چلے جاؤ۔

فرید: اور کتابیں۔

نجمہ: میں دیکھ لوں گی۔

فرید: ٹھیک ہے جی۔

نجمہ: اور ہاں اگر شازیہ کا فون آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر میں ہی ہوں

۔۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔۔

(قدموں کی آہٹ)

نجمہ: (اپنے آپ سے) رات میں دیر تک ان کتابوں سے اُلجھتی رہی... ان دنوں نیند بالکل نہیں آتی جیسے روٹھ گئی ہو، کسی سوچ کی طرح، کسی

اَن دیکھے سپنے کی طرح ،میرے قریب آتی ہے تو بڑی جھجک کے ساتھ .... شرمائی سی .....!!

(کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کے تاثرات)

نجمہ: یہ ناول (اوراق الٹنے کی صدا)..... یہ ناول ابھی اَدھورا ہے... میں یہ ادھورے اوراق کتنی بار پڑھ چکی ہوں پھر بھی بار بار پڑھنے کو من کرتا ہے۔اس کے ہر ہر جملے، ہر ہر لفظ میں مجھے اپنی زندگی کی بکھری ہوئی داستان دکھائی دیتی ہے۔لگتا ہے جیسے شبنم کے قطرے کنول کے پتوں پر بکھر گئے ہوں اور..... اور ایک اَن دیکھی سی تمنا دل کے کسی گوشے میں دھڑکنے لگی ہو(ٹھہر ٹھہر کر)۔لیکن کیا میری زندگی بھی اس ناول کی طرح ادھوری ہے، میری زندگی کے اوراق بکھرے پڑے ہیں، جب یہ ناول مکمل ہوگا تو شاید میری زندگی۔لیکن اب یہ ادھورا ناول مکمل کون کرے گا.... کون لکھے گا اسے.....

(اوراق الٹنے کی صدا)

نجمہ: کتنا پیارا نام ہے۔

آواز: (نجمہ کی آواز میں) ناول یا ناول نگار کا

نجمہ: کون۔۔کون ہو تم

آواز: میں تمہاری آواز ہوں

نجمہ: میری آواز؟

آواز: ہاں تمہارے من کی آواز ، ذہن کی آواز، روح کی آواز۔تمہارے وجود کی آواز.....!!

نجمہ: کیا کہنا چاہتی ہو۔

آواز: تمہیں ناول اس لئے زیادہ اچھا لگتا ہے کہ تم ناول نگار کو چاہتی ہو۔۔ اس ناول کے ہر لفظ میں تمہیں اس کی صورت دکھائی دیتی ہے، تمہاری سوچیں اس کی سوچوں سے ملتی ہیں، اس کی ہر سطر میں تمہارے ماضی کے حسرت بھرے لمحات دھوپ اور چھاؤں کا روپ اپنا کر اُبھرتے ہیں۔

نجمہ: میرا ماضی تو بے آواز ہے اور میرا حال بے پناہ اداسیوں کا سرچشمہ۔ میرا مستقبل، میرا بھوش (خاموش)....پر تم کہاں ہو.....یہاں تو بھی نہیں کوئی میرے بغیر۔ ہاں یہ میرے اندر کی آواز تھی۔ آصف میرا ناول نگار.... کاش اسے میری محبت کا احساس ہوتا.....اور

(اوراق اُٹھنے کے تاثرات)

نجمہ: ناول کا یہ باب.... کل رات پڑھتے پڑھتے آنکھ سی لگ گئی....اِس وقت دوبارہ پڑھنے کو من کرتا ہے.... لکھا ہے.....میں چاہتا ہوں (نجمہ کی آواز آصف کی آواز میں بدل جاتی ہے) میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی دوسرے کے لمس سے بند ہو۔۔ میرے بستر پر کسی دوسرے کی دھڑکنیں سنائی دیں، میرے صوفہ پر کسی دوسرے کی سانسیں میری یادوں کو سمیٹ لیں، میرے کمرے کا ساماں کسی دوسرے کے ہاتھوں سے سجے سنورے، کتنی چھوٹی سی حسرت ہے، کتنی درد بھری تمنا ہے۔۔ لیکن کیا میری تمنا، یہ حسرت پوری ہونے سے میرے جیسے لاکھوں لوگوں کی حسرتیں اور تمنائیں بھی پوری ہوں گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو مجھے (آصف کی آواز نجمہ کی آواز میں بدل جاتی ہے) اگر ایسا نہیں ہوسکتا

تو پھر مجھے اپنے لئے سوچنے کا کوئی حق نہیں۔

(تیز موسیقی اور فیڈ اوٹ)

کمال: نجمہ..... نجمہ

نجمہ: کیا ہے بھیا

کمال: کیا ہو رہا ہے

نجمہ: تیرا انتظار کر رہی ہوں کمال بھیا۔

کمال: یہاں تو آؤ..... دیکھو کون آیا ہے، میرے ساتھ .... آیا نہیں ہے بلکہ پکڑ کے لایا ہوں۔

(۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔۔قدموں کی آہٹ)

کمال: دیکھو یہ آصف ہیں، میرے بہت ہی اچھے دوست، ویسے بڑے مقبول کہانی کار اور ناول نگار بھی ہیں، اپنی کہانیوں کی تلاش میں یہاں آ گئے ہیں، اِن خاموش وادیوں میں، اچانک مڈبھیڑ ہوگئی ہماری۔

نجمہ: آداب۔

کمال: کیا دیکھ رہے ہو بھائی، یہ میری بہن ہے نجمہ ....اِن کے بارے میں ایک بات بتا دوں نجمہ۔

نجمہ: (ہنستے ہوئے) ضرور بتا دیجے۔

کمال: ہم دونوں دوست ضرور ہیں لیکن ملاقاتیں کم ہی ہوتی ہیں، کبھی کبھار ہی ملنا ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیالات میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔

آصف: ارے بھائی انہیں کیوں بے وجہ پریشان کر رہے ہو۔

نجمہ: نہیں میں کیوں پریشان ہونے لگوں۔ بھیا آپ اپنی بات پوری کر لیجئے نا.....!!

کمال: نجمہ ویسے یہ شخص بڑا ہی دلچسپ ہے لیکن ہمیشہ زندگی کی خوبصورتی میں بدصورتی کی تلاش کرتا ہے اور تم جانتی ہو کہ مجھے بدصورتی سے بڑی نفرت ہے۔

نجمہ: (اپنے آپ سے) آصف۔ ناول نگار.... اِن کی کچھ تخلیقات پڑھی ہیں.... کچھ جریدوں میں اِن کے بارے میں پڑھا بھی ہے لیکن انھیں دیکھ کر یہ احساس کیوں ہو رہا ہے کہ ہر شئے مبہم ہے، دُھند میں لپٹی ہوئی ہے۔

-------وقفہ-------

(پالیاں ٹکرانے کی آواز)

نجمہ: آپ کے لئے کافی۔

آصف: شکریہ

کمال: اس پہاڑی علاقے کی صبحیں اور شامیں ویسے بھی یخ میں ڈوبی رہتی ہیں لیکن آج معمول سے کچھ زیادہ سردی ہے۔ نجمہ

نجمہ: کیا ہے بھیا۔

کمال: ایک کپ گرم گرم کافی اور مل سکتی ہے۔

نجمہ: ہاں ہاں ضرور .... آپ بھی لیں گے نا۔

آصف: اگر زحمت نہ ہو۔

نجمہ: بھلا اِس میں زحمت کی کون سی بات ہے۔ فرید.... (زور سے) فرید

فرید: کیا ہے بی بی جی..... آ رہا ہوں (نزدیک آ کر) کہیے بی بی جی

نجمہ: فرید کافی لے آؤ.... لیکن بالکل گرم .....اور شوگر کم....

فرید: جی لاتا ہوں.....

-----وقفہ-----

آصف: میرے ذہن میں جسِ نئے ناول کا خاکہ ابھر رہا ہے اُس کے پس منظر کے لئے یہ پہاڑی علاقہ خوب نکھرے گا..... یہ وادیاں.....

نجمہ: لیکن ابھی آپ نے نہ تو یہ پہاڑی علاقہ دیکھا ہے اور نہ ہی یہاں کی وادیاں۔

آصف: دیکھنے کے لئے ہی تو آیا ہوں۔

کمال: اور پھر دیکھنے میں دیر بھی کتنی لگے گی..... چھوٹی سی جگہ تو ہے۔

نجمہ: نہیں بھیا، جگہ چھوٹی ہو یا بڑی..... ہر جگہ کی اپنی اہمیت اور افادیت ہوتی ہے ایک کریکٹر ہوتا ہے، اکثر لکھنے والے اِن باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس طرح وہ صحیح عکاسی نہیں کر سکتے۔

کمال: نجمہ

آصف: انھیں کہنے دو یار۔

نجمہ: میں کہہ رہی تھی کہ اگر آپ نے اپنی کہانیوں میں صحیح ماحول اور صحیح کرداروں کی نشاندہی کرنی ہے تو اس ماحول میں گم ہونا پڑے گا، اِن کرداروں کے ساتھ گھل مل کے رہنا ہوگا، تب ہی آپ اِن معصوم چہروں کے نقوش ابھارنے میں کامیاب ہونگے (جذباتی انداز) یہ چہرے بے داغ ہیں، یہ لوگ معصوم ہیں۔

آصف: آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں جو ناول لکھ رہا ہوں اُس کی کہانی میرے ذہن کے کھلے ساگر میں ڈبکیاں لگا رہی ہے اُس کے کردار

میرے آس پاس اتھل پتھل مچا رہے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ میں سالہا سال انتظار کروں۔

نجمہ: لیکن.....!!

آصف: ہم لکھنے والے جب لوگوں سے ملتے ہیں تو ہم اُن سے وہی کچھ حاصل کرتے ہیں جو ہمارے کرداروں کو عظمت اور ہماری کہانی کو جلا بخشے۔ ہر آدمی جب بولتا ہے تو کچھ باتیں اُس کے ذہن سے اترتی ہیں اور کچھ دل سے اُبھرتی ہیں، ذہن کی باتیں ہمارے کام آتی ہیں

نجمہ: اور دل.....!!

آصف: دل سے جو باتیں اُبھرتی ہیں وہ جذباتی ہوتی ہیں۔

نجمہ: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی میں جذبات کا کوئی دخل نہیں، نہیں صاحب، زندگی میں جذبات نہ ہوں تو وہ بے سُر ہو کر رہ جائے گی، بے رس، بے مقصد، بے معنیٰ۔

آصف: معاف کیجئے آپ اِس وقت جو باتیں کر رہی ہیں وہ آپ کے دل کی باتیں ہیں، ذہن کی باتیں آپ پہلے کر رہی تھیں۔

کمال: آصف، میری بہن ایک پڑھی لکھی گڑیا ہے تم اسے باتوں میں نہیں جیت سکتے۔

(تیز موسیقی اُبھرتی ہے)

-----وقفہ-----

نجمہ: (اوراق اُلٹتے ہوئے) باب نمبر ۴.... ہر باب اپنی جگہ مکمل ہے ..... دیکھتے ہیں کہ اس باب کے شروعات کہاں سے ہوتی ہے..... اور صدیوں پہلے جو عظیم (آصف کی آواز میں) جو عظیم

شخصیتیں دنیا میں آئیں انہوں نے زمانے کے تلخ وترش کو چکھا، گرم وسرد کو سہا، بے پناہ محبتیں کیں، سچائی کے لئے اپنی جانیں تک دینے سے گریز نہیں کیا اور دنیا چھوڑنے سے قبل اپنی دانائی، فن اور تخلیقی صلاحتیں ہمیں دے گئے لیکن ہم نے اُن سے کیا حاصل کیا، یونہی محروم اور بے ثمر رہے، اندر ہی اندر کھوکھلے ہوتے چلے گئے۔۔۔۔ (نجمہ کی آواز) خلا، مایوسی اور تنہائی کے سناٹوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔۔۔(وقفہ)۔۔۔

۔۔۔موسیقی کی ایک ہلکی سی لہر۔۔۔۔

نجمہ: اس باب میں انہوں نے زندگی کی کتنی بڑی صداقت کو چند جملوں میں قلم بند کیا ہے۔

۔۔۔۔تیز موسیقی۔۔۔۔۔

(گولی چلنے کی آواز ابھرتی ہے)

کمال: میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ وہ دیکھو آکاش کی بلندیوں میں اُڑتے ہوئے پنچھی کو کیسے گرادیا....

نجمہ: بھیا آپ کو ان معصوم پرندوں پر رحم نہیں آتا۔ دیکھیں وہ پنچھی کیسے تڑپ رہا ہے۔ تڑپ تڑپ کا جان دے رہا۔

کمال: جو بے رحم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کسی کی تڑپ سے بے آشنا ہوتے ہیں۔

آصف: جیسے تم..... یہی کہنا چاہتے ہو نا..... ذرا اپنی بندوق مجھے دنیا۔

کمال: (ہنستے ہوئے) بندوق اور تم.... تم تو قلم چلاتے ہو، بندوق چلانا تمہارے بس کی بات نہیں۔

نجمہ: دے دیجئے نا بھیا۔

کمال: تم سفارش کرتی ہوتو دیئے دیتا ہوں، پر سنبھال کر رکھنا۔

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

کمال: اب کیا سوچ رہے ہو، بندوق تمہارے ہاتھ میں ہے....

آصف: سوچ رہا ہوں تمہارے بندوق اور میرے قلم میں کتنا بڑا فاصلہ ہے، تمہارا کام ہے زندگی لینا اور میرا کام ہے زندگی کی حفاظت کرنا۔ میں اپنے قلم کی سیاہی سے لوگوں کو زندہ رہنے کی تحریک دیتا ہوں اور تم..... تم اپنے بندوق کی گولیوں سے معصوموں کے سینے چھلنی کر دیتے ہو، اُن کے سپنوں کو مسمار کر دیتے ہو۔ میں اپنے قلم سے امن و آشتی کا ردرس دیتا ہوں، پیار و محبت کی قندیلیں روشن کرتا ہوں اور تم... تم اُس روشنی کو بجھا دیتے ہو، اُس وقت میں چیخنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں، میں رو بھی نہیں سکتا، آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

نجمہ: پھر وہی دل اور ذہن کی بات آپ کی نظروں کے سامنے آجاتی ہوگی۔ آپ اپنی دل کی بات مان لیجئے نا پھر دیکھئے یہ زندگی کتنی شاداب ہوگی، آپ کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بدصورتی میں بھی خوبصورتی نظر آئے گی۔

آصف: صرف نظر آنے لگے گی نا۔ لیکن حقیقی معنوں میں بدصورتی، بدصورتی ہی رہے گی اسے خوبصورتی کا لباس پہنایا نہیں جاسکتا، رہی دل کی بات..... دل کی بات مان لی تو دھڑکنیں شاید رُک جائیں گی (اپنے آپ سے آہستہ) آج کل یہ کم بخت دل بھی جانے کیا چاہنے لگا ہے جانے کس سوچ، کس نقش اور کس خیال کو اُجاگر کرنے لگا ہے۔

نجمہ: آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔

آصف: (گھبرا کر) میں (جلدی سے) نہیں تو..... کمال صاحب، یہ لیجئے اپنی بندوق....

۔۔۔۔۔۔۔تیز موسیقی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔(وقفہ)۔۔۔۔۔۔

(اوراق الٹنے کی آوازیں اُبھرتی ہیں)

نجمہ: ناول کا ایک اور باب..... ایک اور حصہ (پڑھنے لگتی ہے) میں نے اپنی روح.... (آصف کی آواز) میں نے اپنی روح سے کہا، ٹھہر اور اُمید کے بغیر انتظار کر کیونکہ اُمید غلط چیز کی ہوگی، محبت کے بغیر انتظار کر کیونکہ محبت غلط چیز کی محبت ہوگی، ابھی یقین باقی ہے مگر یقین، محبت اور اُمید سب زندگی کے غلام ہیں اور زندگی۔۔۔۔زندگی وقت کے دربار کی انارکلی، ناچنے والی، بال روم میں، نیم عریاں ٹانگوں کا ناچ دیپک ناچ، عالم بالا میں روحوں کا ناچ اور وقت (نجمہ کی آواز میں) اور وقت جو تباہ کرتا ہے، وقت جو حفاظت کرتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔

(ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے)

نجمہ: آپ سچ کہتے ہیں نا۔۔ یہ افسانوی باتیں تو نہیں۔

آصف: سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ ویسے میرے افسانوی کردار بھی زمین کی کھردری سطح سے ہی اُبھرتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے تم میرے سامنے کھڑی ہو۔۔۔ آج مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کی جھیل خشک ہو چکی تھی، خوابوں کا کنول مرجھا چکا تھا۔

نجمہ: اوراب۔

آصف: اب، جیسے آرزوں کا کنول کھل اٹھا ہے جو اپنی آغوش میں محبت کے موتی لایا ہے۔

نجمہ: میں۔۔۔میں آپ کو چاہتی ہوں۔

آصف: اور میں بھی۔

نجمہ: تو آج آپ دل کے ہاتھوں مجبور ہو ہی گئے۔

آصف: آخر بیچارہ دل ہی تو ہے۔

(۔۔۔۔۔دونوں ہنستے ہیں)۔۔۔۔

۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

آصف: ارے تم یہاں ہو۔

نجمہ: ہاں تو۔

آصف: میں تمھیں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا۔

نجمہ: کاش آپ نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا ہوتا۔

آصف: (ہنستے ہوئے) آخر میرے دل پر تمھیں اعتبار کیوں نہیں۔

نجمہ: اس لئے کہ آپ دل سے زیادہ ذہن کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

آصف: ہاں رکھتا ہوں (ہنستا ہے) لیکن ناول لکھتے وقت۔

نجمہ: اور محبت کرتے وقت۔

آصف: دل ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔۔۔لیکن تم یہ کیا بنا رہی ہو۔

نجمہ: (ہنستے ہوئے) میں.... میں تو اپنا گھر بنا رہی ہوں۔

آصف: مٹی کا گھر.....!!

نجمہ: ہاں تو.... کیا مجھے اُس گھر کا تصور کرنے کا کوئی حق نہیں جو میرا ہو۔

آصف: لیکن تمہارے پاس اتنی بڑی کوٹھی ہے۔۔۔۔کیا وہ تمہارا گھر نہیں۔

نجمہ: وہ گھر (آہستہ سے) نہیں وہ میرا گھر نہیں، عورت کا گھر وہ ہوتا ہے، جہاں اُس کا پیار ہو، اُس کے بچے ہوں.... وہ گھر.... وہ گھر میرا کیسے ہوسکتا ہے جہاں آپ نہیں۔

۔۔۔۔ہلکی ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔Change over ۔۔۔۔۔۔

(نجمہ کی سسکیوں کی آوازیں اُبھرتی ہیں)

نجمہ: (روتے ہوئے اپنے آپ سے) مجھے یاد آرہا ہے، سب کچھ یاد آرہا ہے.... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی، جانے یہ کس لمحے کی کہانی ہے، جانے کس صبح کی کہانی ہے، کس رات کا ذکر ہے، کبھی کبھی ایک لمحہ ایک رات میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ایک رات ایک صدی.... ایک یگ.... کاش وہ لمحہ کبھی نہ آیا ہوتا..... وہ صبح کبھی نمودار نہ ہوتی، وہ رات کبھی نہ جاگتی..... لیکن وہ لمحہ جنم لے چکا تھا، وہ لمحہ بے حد اندھیرا تھا، وہ صبح بڑی منحوس تھی.....

(ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہوجاتی ہے)

اور اُس کے فوراً بعد گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور دور سے شور وغل اُبھرتا ہے۔۔اور پھر یکدم سناٹا چھا جاتا ہے۔۔۔)

نجمہ: (اپنے آپ سے) وادیوں کی اِن خاموشیوں میں ایک عجیب سے ماحول نے جنم لیا۔ آکاش کی نیلی گہری وسعتوں میں کالی کالی گھٹائیں پھیل گئیں، دھوئیں کے کثیف بادل اُٹھ اُٹھ کر بکھر گئے اور ہر سمت گولیاں چلنے کی آوازیں بکھر گئیں، میرے بھائی کمال کے پاس معصوم سے پرندوں کو شکار کرنے کے لئے جو بندوق تھی وہ ضبط کرلی

گئی۔۔۔۔میرے بھائی کے بدلے آصف کو پکڑ کر لے گئے ،شاید اس لئے کہ وہ اس شہر میں اجنبی تھا، ہم لوگ چیختے چلاتے رہے کہ یہ بندوق ہماری ہے، ہمارے پاس اِس کے کاغذات ہیں، آصف ہمارا مہمان ہے ہمارا دوست ہے لیکن ہماری بات کسی نے نہیں سنی.....

. وہ ایک ناول نگار سے کچھ اور بن گیا یا بنایا گیا۔۔۔۔

۔۔۔۔۔تیز موسیقی کی لہر۔۔۔۔۔۔

آصف: نجمہ میں جا رہا ہوں، شاید ہی اب کبھی ملنا ہو۔لیکن.....

نجمہ: لیکن کیا..... آپ رُک کیوں گئے... کہیے نا....

آصف: کبھی کبھی شام ہوتے ہی کالے سیاہ بادل پھٹ جاتے ہیں اور صاف وشفاف بارش برسنے لگتی ہے، مجھے یقین ہے کہ بہت جلد یہ کالے سیاہ بادل پگھل کر صاف وشفاف بارش کے روپ میں برسیں گے، ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔۔۔ہو سکے تو میرا انتظار کرنا.....؟!

۔۔۔۔۔موسیقی۔۔۔۔۔

(فیڈ اوٹ)

شازیہ: (دور سے) نجمہ.... (نزدیک آ کر) میں نیچے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اور تم (ٹھہر کر) تم رو رہی تھیں کیا۔

نجمہ: (اُداس لہجے میں) نہیں تو؟

شازیہ: پھر تمہاری آنکھوں میں کیسے آنسو۔

نجمہ: یہ آنکھیں کبھی کبھی خود ہی ساون کی ندیاں بن جاتی ہیں شازیہ۔

شازیہ: نجوڈیر میں سب کچھ سمجھ گئی۔

نجمہ: بھلا کیا۔

شازیہ: ہاتھ میں کتاب دیکھ کر... وہی ناول ہے نا، آصف کا لکھا ہوا ادھورا ناول۔اب یہ ناول شاید کبھی مکمل نہ ہوگا۔

نجمہ: تم ایسا کیوں سوچتی ہو شازیہ۔

شازیہ: اس لئے کہ افسانہ اور ناول نگار جب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو ٹھکرا کر خود ہی اپنی کہانیوں کے کردار بنتے ہیں، بے حس اور بے رنگ، یہ جب اپنے کرداروں کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں تو اُن کے لئے اپنے اردگرد کا ماحول بے معنیٰ ہو کے رہ جاتا ہے، یہ خود ہی اپنی کہانیاں لکھ کر اپنے آپ سے لپٹ لپٹ کر سو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ وقت کی دہلیز سے اُتر جاتے ہیں۔

نجمہ: نہیں شازیہ نہیں، یہ وقت کی دہلیز سے اُترتے نہیں بلکہ وقت کو اپنے ساتھ ملا کر اُس میں رنگ بھرتے ہیں، وہ ایک تلاش بن جاتے ہیں۔

شازیہ: یہ سب ناولوں کی باتیں ہیں۔

نجمہ: ایسا نہ کہو شازیہ۔

شازیہ: مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل کا یہ زخم خود بخود مندمل ہو جائے گا۔

نجمہ: نہیں وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم اور بھی گہرا ہوگا۔

شازیہ: آج تمہارے چہرے پر یہ اُداسی دیکھ کر میں بہت خوش ہو رہی ہوں نجمہ۔

نجمہ: اُداسی اور خوشی، دو الگ الگ چیزیں ہیں شازیہ۔

شازیہ: ہاں جانتی ہوں لیکن اِس اُداسی میں جو اعتماد اور خلوص جھلک رہا ہے وہ زندہ رہنے کے لئے کافی ہے۔

۔۔۔۔قدموں کی چاپ اُبھرتی ہے۔۔۔۔۔

فرید: (دور سے) بی بی جی۔

نجمہ: کیا ہے فرید میاں۔

فرید: (نزدیک آ کر) چھوٹے صاحب کا فون ہے۔

شازیہ: کمال گھر میں نہیں ہے فرید میاں۔

فرید: نہیں میم صاحب۔۔۔باہر گئے ہیں۔

نجمہ: شازیہ میں ابھی آ رہی ہوں۔

شازیہ: ٹھیک ہے۔

(قدموں کی آواز)

شازیہ: (اپنے آپ سے) جانے یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، ہم تو پیار دامن کے پیغامبر تھے، ہمارے آدرش، ہمارے اصول ساری دنیا میں مقدس سمجھے جاتے تھے پھر یہ کیسی کالی گھٹا چھائی کہ برسنے کا نام تک نہیں لیتی۔۔ اور وہ ناول نگار..... آصف نے کیا جرم کیا تھا..... شاید اُس کا جرم یہی ہے کہ وہ سچائی کا علم بردار ہے اور سچائی بڑی تلخ ہوتی ہے، اس کڑواہٹ کو برداشت کرنے کے لئے دل بھی چاہئے اور ذہن بھی۔۔!

۔۔۔۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کمال: نجمہ۔۔۔نجو

نجمہ: کچھ پتہ چلا بھیا، کب چھوڑ رہے ہیں آصف کو۔

کمال: ابھی نہیں...ابھی کیس کی hearing کچھ اور دن چلے گی...! I have full faith in judiciary یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ بندوق اُس کی نہیں بلکہ میری ہے، میں کورٹ میں لائینس پیش کر چکا ہوں، البتہ

اب یہ ثابت کرنا ہے وہ کس مقصد سے اِن وادیوں میں آیا ہے۔

نجمہ: وہ تو اپنی کہانیوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔

کمال: اوراس کے لئے ثبوت.....

نجمہ: اُس کی تحریر کردہ کہانیاں..... اُس کا ادھورا ناول.....

کمال: یہ کہانیاں بھی اُس کی رکاوٹ بنتی جارہی ہیں

نجمہ: کیا مطلب

کمال: آصف اپنی کہانیوں میں انسانی وقار اور اُس کی عظمت کی آواز بلند کرتا رہا ہے، ظلم، غربت، ناانصافی، پسماندگی اور جہالت کی نشاندہی کرتا رہا ہے، اُس سماج اور معاشرہ کو عریاں کرتا رہا ہے جہاں عزت ومحبت سونے کی عوض نیلام ہوتی ہے، وہ قتل وغارت، ناانصافی کے بارے میں لکھتا رہا ہے۔۔۔۔

نجمہ: یہ کوئی جرم تو نہیں.....

کمال: سچ بولنا ہی اُس کا سب سے بڑا جرم ہے۔۔۔لیکن مجھے یقین ہے۔

نجمہ: کس بات کا۔

کمال: فیصلہ اُسی کے حق میں ہوگا.... سچائی جیت جائے گی۔

نجمہ: انشاءاللہ.....

۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔

گھڑی کی ٹِک ٹِک سنائی دیتی ہے جو وقت گزرنے کے علامت کو ظاہر کرتی ہے۔۔

اور ٹِک ٹِک کے پس منظر میں ایک آواز اُبھرتی ہے۔

آواز: اَندھیرا.... اَندھیرا.... اور وقت بھاگتا رہا، نئی روشنی اور نئے اُجالے

کی تلاش میں.... اور وہ تاریک لمحے فنا ہو گئے.....!!

۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

کمال: (دور سے) نجمہ کہاں ہو تم۔

نجمہ: کیا ہے بھیا۔

کمال: (نزدیک آ کر) تمہارے چہرے پر یہ اُداسی.... اُداسی کا یہ نقاب پھینک دو، مسرتوں اور خوشیوں کے لمحے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

نجمہ: بھیا۔

کمال: آصف قید کی چار دیواری سے آزاد ہو رہا ہے۔۔۔ وہ پھر آزاد فضاؤں میں اپنی کہانیوں کی تلاش میں آ رہا ہے۔۔آؤ آج دونوں مل کر اُس کا سواگت کریں....!!

نجمہ: (خوش ہو کر) بھیا یہ کوئی سپنا تو نہیں۔

کمال: نہیں نجمہ نہیں.... سپنا جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے اور حقیقت اب ہمارے سامنے ہے۔

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

(گاڑی اسٹارٹ ہونے، چلنے اور پھر رُکنے کی آواز)

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔

آصف: یہ آپ کِس روشنی کی بات کر رہے ہیں، کس اُجالے کی کہانی کو دہرا رہے ہیں (روز سے) کہاں ہے روشنی، کہاں ہے اُجالا.... ابھی تو ہر سمت تاریکی ہی تاریکی ہے (آہستہ سے) اندھیرے کا سورج ابھی تک غروب نہیں ہوا۔

کمال: نہیں میرے دوست، اندھیرے کا سورج کب کا غروب ہو چکا ہے،

نور اور اُجالے کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔اب ہم پھر سے اپنی دھرتی کی آزاد فضاؤں میں گھوم پھر سکتے ہیں..... یہ نجمہ ہے۔

آصف: نجمہ.... کون نجمہ.... میں کسی نجمہ کو نہیں جانتا۔

کمال: آصف... تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ بُجھے بُجھے اور کھوئے کھوئے سے کیوں ہو میں تمہارا دوست ہوں، تمہارا ہم راز.... کیا دکھ ہے تجھے.... مجھے بتاؤ۔

آصف: بھلا مجھے کیا دُکھ ہوسکتا ہے... (آہستہ سے)

نجمہ: سُنیے۔

آصف: کون.... کون ہیں آپ

نجمہ: میں نجمہ ہوں.... نجو

آصف: (زور سے) میں..... میں کسی نجمہ کو نہیں جانتا۔

نجمہ: آپ.... آپ بہت تھک چکے ہیں شاید۔

آصف: ہاں میں شاید بہت تھک چکا ہوں۔

نجمہ: آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔آپ چلئے نا۔

آصف: کہاں چلوں..... یہاں تو ہر سمت گھٹن ہے۔

کمال: نہیں آصف،تم جس گھٹن کی بات کر رہے ہو وہ گھٹن ختم ہو چکی ہے۔

آصف: اگر واقعی وہ گھٹن ختم ہو چکی ہے تو میرے سینے پر یہ کیسا بوجھ ہے، میرے ذہن کی پگڈنڈی پر یہ کیسی دُھول ہے، میرے آنکھوں کے سامنے یہ کون سا کالا دیو آناً فاناً کھڑا ہوا جاتا ہے۔

نجمہ: (روتے ہوئے) بھیا،انھیں لے چلئے.... یہاں سے لے چلئے۔

آصف: سنو بھائی، یہ عورت رو کیوں رہی ہے.... میری طرح دُکھی ہے کیا۔

نجمہ: ہاں میں دُکھی ہوں، بہت دُکھی۔

آصف: کیا دُکھ ہے آپ کو۔

نجمہ: کاش میں اپنا دُکھ ظاہر کرسکتی.... کاش (رونے لگتی ہے)

--------فیڈ اوٹ-------

(پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی)

آصف: آپ اس مٹی سے کھیل کیوں رہی ہیں۔

نجمہ: میں کھیل نہیں رہی ہوں، گھر بنا رہی ہوں

آصف: گھر..... آپ گھر بنا رہی ہیں۔

نجمہ: کیا مجھے اپنا گھر بنانے کا کوئی ادھیکار نہیں۔

آصف: یہ گھر بن بھی گیا تو کیا ہوگا۔

نجمہ: اس گھر میں، میں رہوں گا ہم دونوں رہیں گے۔

آصف: ہش... ایسی باتیں نہیں کرتے....

(پس منظر میں پھر ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

نجمہ: دیکھئے مجھے آپ سے شکایت ہے۔

آصف: کیسی شکایت۔

نجمہ: آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ وہ ادھورا ناول مکمل کریں گے

آصف: کون سا ناول.... کیسا ادھورا ناول۔

نجمہ: آپ کا ناول جو اس لئے مکمل ہوتے ہوتے رہ گیا کہ آپ

آصف: (بات کاٹ کر) مجھے گرفتار کرلیا گیا..... یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ

نجمہ: ہاں۔

آصف: کل رات میں دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں، بے شمار

سوچیں میرے ذہن کے سمندر میں اُمڈ آئیں لیکن مجھے لگا کہ میرے قلم کی سیاہی خشک ہوچکی ہے۔ کاغذ کے بکھرے اوراق میرے سامنے پھڑ پھڑانے لگے تو مجھے یوں لگا جیسے میری فکر کے پرندے ذہن کی طویل راہوں میں بٹھک گئے ہوں۔۔۔۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے میرا ماضی میرے سامنے کھڑا ہوگیا.....

نجمہ: ماضی.... آپ کا ماضی تو بہت ہی شاندار ہے، آپ کی تخلیقات کو آپ کے پڑھنے والوں نے پسند کیا ہے، سراہا ہے۔

آصف: کاش میرا ماضی میری تحریروں میں پوشیدہ ہوتا..... میرا ماضی تو میرے لوگوں کے دُکھ سُکھ میں بکھرا ہوا ہے، اُن کی خوشی میری خوشی ہے، اُن کا دُکھ میرا دکھ۔

نجمہ: یہ دُکھ سُکھ آپ تب ہی بانٹ سکتے ہیں جب آپ اپنے قلم کو جنبش دیں گے، آپ کے سینے کے اندر چھپے ہوئے آتش فشاں کو پھٹنے دیں گے۔

آصف: مجھے لگتا ہے جیسے ایک زلزلہ آنے والا ہے۔

نجمہ: زلزلہ، آج آپ زلزلوں سے ڈرتے ہیں، کبھی تو آپ خود زلزلہ تھے

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

(۔۔۔تیز تیز ہوائیں چلنے کی صدا۔۔۔کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔۔۔۔)

کمال: نجمہ کھڑکیاں بند کردو۔۔۔تیز ہوا چل رہی ہے۔

۔۔۔۔(کھڑکیاں بند کرنے کی آواز)۔۔۔۔۔۔

کمال: آصف کہاں ہے۔

نجمہ: وہ اپنے کمرے میں ہیں.....

کمال: میں نے ڈاکٹر وانی سے بات کی تھی۔

نجمہ: کیا کہا ڈاکٹر صاحب نے۔

کمال: اُن کی یہی رائے ہے کہ آصف ذہنی کرب میں مبتلا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوچوں کو قلم کا روپ دے۔

نجمہ: کوشش کو کر رہی ہوں بھیا۔

(دور سے کسی چیز کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز۔۔۔)

نجمہ: (گھبراتے ہوئے لہجے میں) شاید انہوں نے قدِ آدم آئینہ پر کوئی چیز پھینک دی۔

کمال: جلدی سے چلو....

.....وقفہ.....

آصف: (زور سے) میں نے اسے ختم کر دیا۔

کمال: کسی کی بات کر رہے ہو

آصف: اسِ قدِ آدم آئینے میں کوئی شخص گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہا تھا میرا مذاق اُڑا رہا تھا۔۔ مجھے لگا جیسے پرانے وقتوں کا وہ رس بھرا لمحہ اجنبی راہوں سے ٹکرا کر میرے وجود کے اندھے نگر میں ایک پُل بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔۔۔ دیکھو اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں

کمال: (زور سے) آصف

آصف: صرف ایک خلا۔

نجمہ: اِنھیں سنبھالئے بھیا..... میں ڈاکٹر وانی کو یہاں آنے کے لئے فون کرتی ہوں۔۔

(فون ڈائیل کرنے کے تاثرات اور فیڈ اوٹ)

(پس منظر میں بارش برسنے کے تاثرات)

نجمہ: میں نے کہا تھا نا شازیہ وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گے.... دیکھئے شازیہ آپ سے ملنے آئی ہے۔

شازیہ: آداب

آصف: کیسی ہیں آپ

شازیہ: شکریہ....اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

آصف: میری طبیعت کو کیا ہو گیا تھا۔اچھا بھلا تو ہوں۔

نجمہ: کل بخار ہوا تھا نا آپ کو،اسی لئے پوچھ رہی ہیں۔

آصف: ہاں بخار تو ہوا تھا۔

شازیہ: بہت دنوں سے آپ کی کوئی تحریر نظروں سے گذری نہیں۔

آصف: کچھ لکھا ہی نہیں۔

شازیہ: نہ لکھنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔

آصف: میں خود بھی نہیں جانتا اور آپ (زور سے) آپ کچھ اور جاننا چاہتی ہیں۔

شازیہ: جی...میں....میں

آصف: میں باہر جا رہا ہوں...بارش ہو رہی ہے نا، بارش میں بھیگنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے، بارش برستی ہے تو کائینات کا رنگ نکھر جاتا ہے، ہر شئے دُھل جاتی ہے۔

نجمہ: بارش میں بھیگنا آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔

آصف: آپ میری تکلیف کا بہت خیال رکھتی ہیں، کیوں، کس لئے؟

نجمہ: (رونے کے انداز میں) میں آپ کو چاہتی ہوں، بہت پیار کرتی ہوں آپ سے، مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

آصف: میری حالت.... لیکن اُس وقت یہ آنسو کہاں تھے جب..... میں ..... میں جا رہا ہوں۔

نجمہ: رُک جائے گا..... سُنیئے تو سہی

(آصف کے جانے کے تاثرات)

شازیہ: حوصلہ رکھو میری اچھی بہن۔

نجمہ: یہ سب کیا ہو رہا ہے شازیہ .....

شازیہ: ڈاکٹری مشورہ..... ڈاکٹر کیا کہتے ہیں

نجمہ: ڈاکٹر وانی ہر دوسرے تیسرے دن دیکھنے آتے ہیں۔

۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔(فیڈ اوٹ)

۔۔۔۔۔ ٹِک ٹِک کی آواز اُبھرتی ہے۔

نجمہ: (سرگوشی کے عالم میں) بھیا

کمال: کیا ہے۔

نجمہ: (آہستہ سے) آہستہ بولیئے

کمال: (آہستہ سے) کیا ہے نجمہ

نجمہ: وہ دیکھئے پردے کے اس پار .... وہ سامنے والی کھڑکی سے....

کمال: یہ تو آصف ہے، یونہی بے مقصد کمرے میں گھوم رہا ہے، طبیعت ٹھیک ہے نا اِس کی۔

نجمہ: آپ ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پا رہے ہیں، میرے قریب آیئے نا.....ہاں....وہ دیکھئے انہوں نے اپنے ادھورے ناول کو سامنے رکھا ہے، کاغذ بھی پڑے ہیں، قلم بھی ہے وہ لکھنا چاہتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ اُن کے ذہن کی راہوں پر پڑی دُھند آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے، وہ پھر اپنی کہانیوں کی دنیا میں لوٹ رہے ہیں۔

کمال: پھر یہ ہچکچاہٹ کیوں۔

نجمہ: بس ایک risk لے رہی ہوں بھیا۔

کمال: کیسا risk ۔۔۔ what do you mean ۔۔۔۔ میں ..... میں

نجمہ: آپ دیکھئے تو سہی

۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔

کمال: یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے

نجمہ: یہ اُن کی لکھی ہوئی ایک پرانی کہانی ہے۔ ایک زخم اور سہی.... میں اس کہانی سے چند جملے پڑھتی ہوں، شاید ایسا کرنے سے اُن کے خیالات کا طویل سلسلہ جڑ جائے گا۔۔۔(زور سے پڑھنے لگتی ہے) اِن سب چہروں کا سیلاب میرے اپنے چہرے میں جانے کہاں چُھپ گیا ہے، میں تو ہر چہرے میں اپنے چہرے کو تلاش کرتا ہوں مگر ہر چہرے پر اجنبیت کا خول چڑھا ہوا ہے۔۔اور ہر چہرہ مجھ پر ہنستا ہے۔۔وقت کا درپن تو میرے چہرے سے اُجلا ہے ان سب چہروں سے اُجلا ہے، مگر میرا چہرہ تو میرا چہرہ ہے۔

کمال: (آہستہ سے) خاموش ہو جاؤ۔

نجمہ: بھیا۔

کمال: وہ دیکھو.... اب یہاں سے چلتے ہیں

نجمہ: چلئے بھیا

---وقفہ----

(----صبح کا وقت، پرندوں کی چہچاہٹ اور دور سے اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے----!)

آصف: (زور سے) کوئی ہے۔ نجمہ ... نجمہ کہاں ہو تم۔

نجمہ: بھیا (خوش ہو کر) بھیا وہ مجھے بُلا رہے ہیں۔

آصف: نجمہ

کمال: جاؤ..... نجمہ جاؤ.....

---وقفہ---

نجمہ: آپ..... آپ

آصف: ہاں میں ہوں۔ پہچان رہی ہو نا۔

نجمہ: آپ۔

آصف: مجھے یوں گھور گھور کر نہ دیکھو... میں آصف ہوں... تمہارا ناول نگار... تم مجھے چاہتی ہو نا۔

نجمہ: (روتے ہوئے) ہاں، چاہتی ہوں، بہت پیار کرتی ہوں۔

آصف: تو پھر یہ آنسو کیوں۔

نجمہ: یہ آنسو میری محبت کے راز دار ہیں، اس لئے بن پوچھے ہی اُمڈتے چلے آرہے ہیں۔

آصف: میں نے.... میں نے وہ ادھورا ناول مکمل کر لیا ہے---وہی ناول جو

تمہیں بے حد پسند ہے۔ ہاں ہاں.....!!

نجمہ: بھیا آپ کہاں ہیں، انہوں نے پھر سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ وہ ادھورا ناول بھی مکمل کر لیا ہے۔

آصف: کائینات کی ہر شئے حرکت میں ہے، ایک جاتی ہے اور دوسری آتی ہے، پرانے رشتے ٹوٹتے ہیں اور نئے تعلقات جنم لیتے ہیں۔ نظریات اور خیالات بدل جاتے ہیں۔۔۔ سر بلند طاقتیں فنا ہو جاتی ہیں اور نئی تخلیقی قوتیں وجود میں آتی ہیں۔

نجمہ: آصف.....!!

آصف: آؤ، پیڑوں کے اِن سرخ پیلے پتوں پر اپنا نام لکھ کر بین کرتی ہوئی ہواؤں کے ساتھ کہیں دور چلیں.... بہت دور....

کمال: (دور سے) کہاں ہے میرا دوست، میرا یار..... میرا ناول نگار

آصف: میں یہاں ہوں۔ آ جاؤ میرے بھائی، میرے دوست..... وادیاں ایک بار پھر خاموش ہو گئی ہیں....

کمال: (نزدیک آ کر)۔۔ ہاں میرے دوست، وادیاں واقعی خاموش ہو گئی ہیں، اب آکاش کی وسعتوں میں اُڑتا ہوا کوئی بھی پنچھی بندوق کی گولی کا شکار نہیں ہوگا....

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

☆☆☆

تبصرہ کتب

ا

رسالہ : نعت نمبر ''رسالہ حکیم الامت''

مدیر : ڈاکٹر ظفر حیدری

مبصر : مرزا بشیر احمد شاکر

اس کے بعد کئی سال تک پروفیسر اکبر حیدری کی ادارت میں اس جریدہ کے کم سے کم بہتر (۷۲) شاندار شمارے زیور طبع سے آراستہ ہو کر دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ مرحوم ''حکیم الامت'' کے اپنے وقت کے شماروں میں بہت عمدہ قسم کے مقالات اور تحقیقی مواد پر مشتمل مضامین قلم بند کرتے رہے۔ خاص کر علامہ اقبالؔ کی شعر و شاعری، فن اور فکر اقبال کے فروغ کے لیے مرحوم حیدری صاحب نے بہت کچھ مواد فراہم کیا۔ غالبؔ اور قدیم زمانہ کے شعراء کرام کے بارے میں بھی رسالہ ''حکیم الامت'' نے قابلِ قدر کام کیا۔ بہت سارے غیر مطبوعہ مضامین بھی رسالہ کی زینت بن گئے۔ بیرونی ممالک سے بھی نامور ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین آتے رہے اور اس طرح مختصر وقت کے اندر اندر اس دیدہ زیب جریدہ نے اپنے بال و پر پھیلائے اور دور دور تک اپنا پیغام پھیلا کر شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ بانی رسالہ یعنی ڈاکٹر اکبر حیدری رسالہ کے محاضرات والے صفحوں پر قلم کاروں اور شاعروں کے فوٹو گراف بھی چھاپتے رہے۔ اس طرح یہ رسالہ اور بھی دلکش بن گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم وقتوں کے شعرائے کرام و سلاطین کے نایاب یا کمیاب تصویریں بھی کبھی کبھی اس میں چھاپ لیں۔ مثلاً واجد علی شاہ مرحوم، محمد حسین آزادؔ، والیِ حیدرآباد دکن میر عثمان علی خان کی تصویروں سے بھی اپنے رسالہ کو چار چاند لگائے۔ مگر اے وائے بقولِ غالبؔ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر دیکھئے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ ہے پا رکاب میں

بالآخر برِ صغیر ہندو پاک کا یہ نامور ادیب اور یکتائے زمانہ قلم کا مردِ آہن بھی موت کے تیز پنجوں کا شکار ہو گیا اور فرمانِ الٰہی **کُـل نَـفْـسٍ ذائقةُ الْمَوت** کے سامنے بہت چاہنے والوں کو غم زدہ چھوڑ کر عالمِ عقبیٰ کو سدھار گیا.....**اِنا لِلّٰہِ وَاِنا اِلَیْہِ راجَعُون!**

پروفیسر اکبر حیدری کی وفات کے بعد رسالہ ''حکیم الامت'' کو جاری و ساری رکھنے کی ساری ذمہ داری اُن کے فرزند جناب ڈاکٹر ظفر حیدری کے کندھوں پر پڑ گئی۔ گو کہ اکثر قارئین کا یہی خیال تھا کہ ظفر صاحب اس عظیم ذمہ داری کو شاید نبھا نہیں پائیں گے اور باپ کے مشن کو غالباً ادھورا چھوڑیں گے۔ مگر بقول شاعر ؎

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

والدِ مرحوم کی وفات کے بعد اس قابل اور با صلاحیت بیٹے نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ آپ کے والد کے مشن کو برابر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ والد کی وفات کے غم واندوہ کے عمیق سمندر میں ڈوب کر بھی اس جوان سوال ایڈیٹر نے رسالہ ''حکیم الامت'' کا معمول کا شمارہ اپنے وقت پر منظرِ عام لایا اور آج بھی اپنی ہمت و جواں مردی سے وہ یہ رسالہ اپنے وقت بلکہ کبھی کبھی sheduled time سے قبل بھی نکالتے رہتے ہیں۔

وقتاً فوقتاً دانشور اور علمی شخصیات نے پروفیسر اکبر حیدری کے مبارک ہاتھوں سے اجرا شدہ ماہنامہ ''حکیم الامت'' کے بارے میں اپنی آراء اور زریں خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں قابلِ ذکر فرزند اقبالؔ مرحوم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

''جہاں تک میری نظر ہے کہ بھارت کا مجھے معلوم نہیں البتہ پاکستان بھر میں مجھے اس جیسا (یعنی رسالہ ''حکیم الامت'') رسالہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح دیگر اہل دانش جیسے محترم ظہیر الدین اثر یزدانی جمالی' ڈاکٹر سید تقی عابدی' ڈاکٹر سید عباس علی شاہ' عرفان علی اور بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالہ کی اپنے مکتوبات' مراسلات اور پیغامات کے ذریعہ سراہنا کی ہے اور اس کے ادبی معیار کو پرکھا ہے۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ یہ سارے مراسلات بطور ثبوت ماہنامہ متذکرہ کی فائلوں میں چھپ چکے ہیں۔ دراصل یہ مرحوم حیدری صاحب کی علم وادب اور اردو زبان وادب کے ساتھ والہانہ الفت اور شیفتگی تھی کہ دبستانِ اردو کا یہ سرسبز اور تناور درخت لہلہا تا نظر آتا ہے''۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

زیر تبصرہ ''نعت نمبر'' ڈاکٹر ظفر حیدری کی زیر ادارت شائع ہوا ہے۔ اس خصوصی شمارہ کی اپنی علیٰحدہ اہمیت اور پہچان ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ سرتاجِ انبیاء امام الاولیاء تاجدار نبوت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اُن کی ذات مقدسؐ کے بارے میں یہی کیا کچھ کم ہے کہ فرمایا گیا ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ پہلے بھی مختلف علمی اداروں' اکادمیوں اور

عاشقانِ رسولؐ کی طرف سے نعتیہ ادب اور نعت پر شمارے نکلے ہیں۔مگر ''حکیم الامت'' کا نعتِ رسولؐ نمبر انفرادی ہے۔یہ نمبر بہت ہی جاذبِ نظر اور دیدہ زیب ہے۔اس کے ٹائٹل پر علامہ اقبالؔ کے یہ نعتیہ اشعار درج ہیں:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اس کے ساتھ حروف جلی میں اسمِ مقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو رنگوں سرخ اور برنگِ سفید ڈیزائن کے ساتھ لکھا ہے۔محاضرات والے صفحے پر اس شمارے کے اہلِ قلم کی تصویریں ان کے ناموں کے ساتھ درج ہیں اور اسی کے اُلٹے صفحے میں قدیم وجدید شعرائے کرام کی خوب صورت تصویروں سے نعت نمبر کو سجایا گیا ہے۔رسالے کا اداریہ نعت رسولؐ نمبر کی شانِ نزول پر مشتمل ہے۔اس نعتیہ گلدستہ کے صفحہ نمبر ۲ پر مرحوم نعوت نگاروں کی فہرست کے ساتھ بقیدِ حیات اردو شعراء کے اسمائے گرامی کی فہرست دی گئی ہے۔پھر ابتدائی پانچ صفحات پر عربی زبان کے بیش بہا نعوت درج ہیں۔نعتوں کے اختتام پر ان کی اردو زبان میں تشریح کی گئی ہے۔دورِ رسالت سے تعلق رکھنے والے نعت نگاروں کے اسمائے گرامی یوں ہیں:

۱۔سیدنا ابو طالب ۲۔حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ (المتوفی ۶۲۰ء) ۳۔حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب (المتوفی ۶۲۵) ۴۔حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ (المتوفی ۶۴۰ء) ۵۔حضرت علی مرتضیٰؓ (الشہید ۶۶۱ء) ۶۔حضرت فاطمۃ الزہراؓ (المتوفی ۶۳۲ء) ۷۔حضرت امام زین العابدینؒ (المتوفی ۷۱۲ء)

زیرِ تبصرہ گراں قدر نعت نمبر میں پانچ صفحات پر مشتمل فارسی زبان کے بلند

پایہ اور عظیم المرتبت عاشقان نبیؐ کے گلہائے عقیدت درج ہیں جو کہ مولانا رومی، شیخ سعدیؒ، امیر خسرو دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن جامؔی، مولانا معین الدین معینی، عرفؔی شیرازی، علامہ اقبالؔ، اسداللہ خان غالبؔ، غلام قادر گرامؔی جالندھری، شاہ نعمت اللہ ولی، علامہ شبلی نعمانی، ملا وجہؔی نے اپنے اپنے زمانے میں تحریر کیے تھے۔ یہ سبھی نعوت فارسی زبان وادب کے بہترین اور عمدہ نمونے ہیں۔ ان سبھی متوفین کی زبان دانی اور قادرالکلامی کا کوئی جواب نہیں ہے۔

''حکیم الامت'' کے اس نعت نمبر میں صفحہ ۱۶ سے لے کر صفحہ نمبر ۷۶ تک یعنی ۶۳ صفحات پر اردو نعوت کی رنگین اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی اور دل اور روح کو مسرور کرنے والی کہکشاں نظر آتی ہے۔ قدیم وجدید شعرائے اردو کی نعتیں اس گلدستہ کی زینت بن گئی ہیں۔ ان میں سیرتِ سرور عالمؐ اور مدحِ رسولؐ کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان شعرائے مقتدر کے ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے جس کی تفصیل یہاں لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔ البتہ چند شعرائے کرام جنہوں نے شہرت پائی تھی کے اسماء یہاں درج کیے جاتے ہیں:

میر تجلّی، میرؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، مومنؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، داغؔ، حالیؔ، اکبرؔ الہ آبادی، حسرتؔ موہانی، مولانا جوہرؔ، دلورام کوثریؔ، کشن پرشاد شادؔ، آغا حشر کشمیری، شبیبؔ رضوی، مظفر ایرجؔ۔

بقیدِ حیات چند اردو شعراء کے نام یہ ہیں:

'ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدؔ، مرزا محمد اشفاق شوقؔ، اشفاق مجمؔی، محبوب الرحمٰن نیازیؔ، حبیب الرحمٰن نیازیؔ، بشیر آتشؔ کشمیری، سرورؔ خلیقی، مجیبؔ احمد صدیقی، فرحت ایوبیؔ اور دیگر بہت سے شعراء بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

ان شعراء کی نعتیں اور مدحیہ اشعار حضرت رسالت مآبؐ کی بارگاہ اقدس میں

عاشقانہ نذرانۂ عقیدت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ اشعار پڑھ کر ایک صاحب ایمان کے پژمردہ دل کی کونپلیں تر و تازہ اور سدا بہار روپ دھار لیتی ہیں اور عاشق زار کے جذبات مچل مچل کر برانگیخت ہو جاتے ہیں۔ دل کے سمندر میں عشق و محبت کا ایک طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔

عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے علاوہ رسالہ ہٰذا میں انگریزی زبان کی تین نعتیں درج ہیں اور یہ نعوت علامہ اقبالؔ، عرفان علی خان اور عائشہ صدیقی کی ہیں۔ شیدایانِ اقبال کے لیے ان کی انگریزی نعت ایک تحفہ سے کم نہیں ہے۔ اس کے بعد کشمیری زبان کا خیال رکھتے ہوئے فاضل مدیر نے کشمیری زبان کی بھی تین عدد نعتیں رسالہ میں شامل کی ہیں۔ یہ نعتیں بالترتیب مرزا بشیر شاکرؔ (راقم تبصرہ)، منظور احزامؔ اور پتا مبر ناتھ درفانیؔ کشمیری کی ہیں۔

اس نعت نمبر صفحہ ۸۳ سے ۱۵ عدد نثری مضامین شروع ہوتے ہیں۔ یہ مضامین پڑھ کر صنفِ نعت اور نعتیہ ادب کی تاریخ وغیرہ سے پڑھنے والے کو واقفیت ہوتی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ نعتِ نبیؐ کا پہلا مجموعہ دیوان ابی طالب از ڈاکٹر سید علی عباس شاہ۔
۲۔ محسنؔ کاکوروی اور ان کی نعت گوئی از پروفیسر اکبر حیدری کشمیری۔
۳۔ غالبؔ کی نعتیہ غزل پر حالیؔ کی شاہکار تخمیس از ڈاکٹر سید تقی عابدی۔
۴۔ اردو مرثیوں میں نعت از پروفیسر فضل امام۔
۵۔ مناظرؔ عاشق ہرگانوی کی نعتیہ شاعری از سعید رحمانی ایڈیٹر ادبی محاذ۔
۶۔ حامدؔ امروہوی کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سید تقی عابدی۔
۷۔ سہیل غازی پوری ایک معتبر نعت گو از فرحت حسین خوشدلؔ۔
۸۔ اردو نعتیہ شاعری ایک جائزہ از ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفقؔ۔

۹۔ علامہ اقبالؔ بارگاہِ رسالت میں از پروفیسر تسکینہ فاضل۔
۱۰۔ اردو نعت گوئی ایک جائزہ از منیر حسین حرہ۔
۱۱۔ فیضؔ کی نعت از ڈاکٹر سید تقی عابدی۔
۱۲۔ قرآن کی رو سے نعت کی تاریخ کا مختصر جائزہ از نسیمہ ایس حیدری۔
۱۳۔ مجمؔی کا نعتیہ کلام از مرتضیٰ حسین بلگرامی۔
۱۴۔ کشمیری مرثیہ میں نعت از منظور احمد احزؔام۔
۱۵۔ نعتِ رسولؐ اور اردو شعراء از سید شمیم احمد۔

مضمون نگاروں کے یہ پُر مغز اور پُر از معلومات مضامین اور نثری تخلیقات ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ یہ سبھی مضامین پڑھنے کے بعد صنفِ نعتِ رسولؐ اور نعتیہ ادب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ طلبا اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے رسالہ ''حکیم الامت'' کا یہ خصوصی شمارہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : تجلیات معرفت
مصنف : ڈاکٹر الطاف حسین یتو
مبصر : ڈاکٹر محمد اقبال لون

ڈاکٹر الطاف حسین یتو گزشتہ کئی برسوں سے علم وادب اور قلم قرطاس سے رشتہ بنائے ہوئے ہیں۔موصوف وادیٔ کشمیر کے موقر اخباروں اور روزناموں میں مسلسل لکھتے ہیں اور لکھ رہے ہیں جو یقیناً قابلِ داد عمل ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر الطاف حسین یتو کی اردو زبان میں اولین تصنیف ''تجلیات معرفت'' زیورطبع سے آراستہ سے ہوئی ۔متذکرہ کتاب میں زیادہ تر وہیں نگارشات شامل ہے جو گزشتہ سالوں میں وادی کے مختلف اخباروں اور روزناموں میں شایع ہوئے ہیں ۔اس کتاب میں زیادہ تر مذہبی، دینی اور اسلامی فکر وفلسفے کے حوالے مضامین شامل ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ ہے کہ مصنف کو اس موضوع کے ساتھ ایک ذاتی وابستگی کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلم کا بھی خاصا اثر ہے۔دوم یہ ہے کہ موصوف یہاں کی نوجوان نسل میں اخلاقی شعور، دینی احکام اور اخلاقیات کی تربیت کے خواہاں ہے۔ کیونکہ مصنف محکمہ اعلیٰ تعلیم میں علم اسلامیات کی درس وتدریس سے منسلک ہیں تاہم وفور شوق کے سبب دینیات،علم وادب اور معاشرتی معاملات ومسائل ومذہبی امور کے موضوعات پر کالم سپردِ قلم کرتے رہتے ہیں ۔موصوف بہت ہی محنتی اور سنجیدہ نوعیت کے قلمکار ہیں اور اپنے گردونوح اور مذہبی معاملات میں گہرا ادراک رکھتے ہیں، خاص کر وادیٔ کشمیر میں سماجی بے راہ روی، مذہبی منافرت اور اخلاقی قدروں کی پامالی

وغیرہ موضوعات پر کافی سوجھ بوج رکھتے ہیں اور قلم وقرطاس کے توسط سے ایک بیداری کی مہم چلانے میں منہمک ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب کے مشمولات اس طرح ہیں

۱۔معرفت حق اور معرکہ خرد وجنوں

۲۔قافلوں کے نگہبان: عظیم المرتبت معلمین

۳۔آں کتاب زندہ، قرآں حکیم

۴۔ذبح عظیم اور توحید کی بازیافت

۵۔سیدنا ابراہیم: تسلیم ورضا کا ابدی عنواں

۶۔خلق عظیم اور اسوہ حسنہ کی تکمیل

۷۔ربیع الاول: اصلی عالمی بہار

۸۔محمد ﷺ: الصادق الامین

۹۔معراج النبی: عبدیت کا عروج

۱۰۔معراج النبی: نور کی تکمیل کا سفر

۱۱۔جبین نیاز اور دلنشین شخصیت کے خدوخال

۱۲۔زکوۃ: پاکیزگی کی شاہراہ عظیم

۱۳۔قناعت شعاری: ایک شاہراہ نجات

۱۴۔قرآن، تقوی اور رمضان

۱۵۔لیلۃ القدر: اہمیت وفضیلت

۱۶۔عید الفطر اور تکبیر رب

۱۷۔عید الفطر: دائمی مسرت کی تمہید

۱۸۔داستان حرم اور قربانی

۱۹۔فرات کنارے: سیدنا حسین کی داستان عزیمت

۲۰۔ہابیل سے سیدنا حسین تک: داستان عزیمت مردانِ حر
۲۱۔مولانا رومی؛نظریہ تعلیم وتعلم
۲۲۔وادیٔ زمزم سے وادیٔ جہلم تک
۲۳۔میر سید علی ہمدانی: کشمیر میں روحانیت کے نقیب
۲۴۔معرکہ روح وبدن اور سید السادات
۲۵۔شیخ نورالدین: عرفان وزہد کے علمبردار
۲۶۔شیخ نورالدین: روایت زہد کے علم بردار
۲۷۔علامہ اقبال کا تصور ذکر وفکر
۲۸۔خطبات علامہ اقبال کا تنقیدی شعور
۲۹۔فکر مسلم کا انحطاط: علل، اثرات اور علاج
۳۰۔قلم وقرطاس اور تحفیظ علم وعلاج
۳۱۔رحمتیں قدم قدم
۳۲۔روحانیت اور مادیت کی کشمکش
۳۳۔نور عرفان اور تجلیات ربانی

درجہ بالا عنوانات سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف چاہتا ہے کہ کیسے دین اسلام، علم، ادب اور فلسفہ کے مختلف شعبوں کو ایک ساتھ جوڑ کر نوجوان نسل کو بہتر سمجھایا جاسکتا ہے۔فی الوقت یہاں کی نوجوان نسل نشہ آور ادویات، آن لائن جوا (Online games)، سوشل میڈیا فوبیا، فحاشی کاموں کے ساتھ ساتھ کئی برائیوں میں الجھی ہوئی ہے جن کو راہ راست پر لانے کے لیے اچھی تربیت اور دینی شعور کی آگہی ناگزیر ہے۔کیونکہ یہی نئی نسل ہمارا مستقبل ہے اس کی بہتر رہنمائی، ذہن سازی اور اخلاقی سازی ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے۔مصنف چونکہ اسلامیات کے طالب علم ہے اور

اسلامی تاریخ، فلسفے اور دینی امور واخلاقیات پر انگریزی میں تقریباً آٹھ کتابیں شایع کی۔اس سلسلے میں موصوف اپنی کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔مصنف کتاب ہذا کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''یہ مضامین اسلام، تاریخ، فلسفہ اسلام، تاریخ علمیات اسلام، معاشرت اور ادب کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں''

زیر تبصرہ کتاب نئی نسل کے قلوب واذہان کو بیدار کرنے میں ایک اچھی کوشش ثابت ہوسکتی ہے۔یہ کتاب اپنی اندر تروتازگی، رنگارنگی اور معلومات کا ایک گنجینہ لیے ہوئی ہے۔واضح رہے ان موضوعات پر قلم اٹھانا اور فکری ومعنوی ہم آہنگی برقرار رکھنا مصنف موصوف کے وسیع مطالعے، ذہنی بالیدگی اور پختہ فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔اس کے علاوہ میں کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے انتہائی سلجھی ہوئی، سلیس اور عام فہم ہے اور اسلوب کی جدت اور پیش کش کی ندرت کی بنا پر اس میں قاری کو اپنی طرف راغب اور متوجہ کرنے کی قوت موجود ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی کتابیں جموں وکشمیر میں اردو زبان کے فروغ کے لئے مفید ہیں اور نوجوان نسل کے لئے بہت اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔اس کوشش کے لیے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

کتاب کا نام : مٹی کے موسم
شاعر : بلراج بخشی
مبصر : ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

بلراج بخشی اُردو کے ایک جانے مانے شاعر، افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ ان کا تازہ شعری مجموعہ "مٹی کے موسم" حال ہی میں منظر عام پر آیا۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کی شاعری کسی خاص رجحان یا نظریہ تک محدود نہیں ہے۔ "مٹی کے موسم" میں شامل غزلیں اور نظمیں اُردو غزل و نظم کے ہر موسم کا ساتھ نبھاتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، ان کے یہاں کلاسیکیت بھی ہے۔ ترقی پسندی بھی اور جدید و مابعد جدید ادبی تصورات کے سائے بھی، جس کا اندازہ اس کتاب میں شامل درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

رقیب ہو گیا میرا ہی پیرہن آخر
نہ آشکار ہوا مجھ پر وہ بدن آخر
(کلاسیکی)

اب وہ پہلے سے مراسم تو نہیں ہیں لیکن
جہاں جاتا ہوں میں اکثر وہ وہیں ہوتا ہے
(کلاسیکی)

میں بھی کہہ سکتا ہوں بلراج فسانہ اپنا
پاسداری ہے روایت کی جو خاموش رہوں
(کلاسیکی)

گھنے درخت کا سایہ ہٹا گیا کوئی
ہوا کے بھیس میں پتے گرا گیا کوئی
(جدید)

لاکھ سمجھائے کوئی سمت ونشان منزل کے
آئے دن لٹتے ہی رہتے ہیں مسافر دل کے
(جدید)

اس طرح زندگی گزار آئے
اب کسی پر نہ اعتبار آئے
(جدید)

میرے ہاتھوں کی لکیروں سے نکل کر آئے
وہ اگر میرا مقدر ہے تو چل کر آئے
(جدید)

ماضی و حال کے ہر غم سے سبکدوش رہوں
ہوش میں آنے سے بہتر ہے کہ بے ہوش رہوں
(مابعد جدید)

جان کر بھی نہیں پہچانتے ہیں لوگ اگر
یہی اچھا ہے کہ میں خود سے بھی روپوش رہوں
(مابعد جدید)

"مٹی کے موسم" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی بحر میں غزلیں ملتی ہیں۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کے سبب بلراج بخشی کے شعر میں معنی کے علاوہ کیفیت اور تاثر کے بھی دائرے بنتے ہیں۔ بلراج بخشی یہ جانتے ہیں کہ کس طرح کے موضوع کے لیے کیسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس لیے کتاب میں شامل غزلوں میں اور نظموں میں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور اسلوبیاتی انفرادیت بھی۔ بلراج بخشی نے اپنی نظموں میں عصری مسائل کو علامتی اور استعاراتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "مٹی کے موسم" میں غزلوں کی طرح نظموں میں بھی انفرادیت ہے۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی ایک نظم "قرض" بے حد اہم ہے جس میں انھوں نے آج کے انسان کو اپنے اجداد کے اعمال کا قرض دار بتایا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اپنے آبا و اجداد کے نقش قدم پر چل کر ہی ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کوئی روشن راہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

بلراج بخشی کی ایک نظم "میرے گناہ سبھی" پابند نظم کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن اس نے نظم میں غزل کا انداز بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ نظم کے یہ چار مصرع قابل توجہ ہیں

دعائیں آپ کی ہیں بدعائیں میری ہیں
جفائیں آپ کا حق ہے وفائیں میری ہیں
خلوص و دوستی اور اعتماد و پاس قرار
یہ لغزشیں ہیں مری یہ خطائیں میری ہیں

بلراج بخشی کی نظم "مٹی کے موسم" کا موضوع زندگی کی یکسانیت سے اکتاہٹ اور بیزاری سے عبارت ہے۔ موسم کا استعارہ انھوں نے اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس دائرے میں سماجی اور سیاسی ہر طرح کی تبدیلیاں سمٹ آئی ہیں۔ موسم کے بدلنے سے انسان کے حالات نہیں بدلتے۔ اسی لیے بلراج بخشی یہ کہتے ہیں

کہ وقت کوشش کے باوجود اپنی بے رنگی کو چھپا نہیں پائے گا اور ایک وقت آئے گا جب انسان موسموں کی لایعنیت کا شعور حاصل کر لے گا۔ اس نظم کے آخر کے ان مصرعوں پر غور کریں کہ صاحب کتاب کیا کہنا چاہتے ہیں، اچھی طرح واضح ہو جائیگا۔

بدلتے ہوئے موسموں سے میری التجا ہے
اگر ہو سکے تو مرے گھر کے آنگن میں
ہر روز ایسی شعائیں اتاریں
جو پہلے کی ساری شعاؤں سے ہوں مختلف اور نئی،
میری آنکھوں میں بھر دیں نئے رنگ جو سات رنگوں
کی فہرست میں بھی نہ ہوں
رات دن کا یہ لا انتہا سلسلہ
اپنے چہرے پہ
ان سات رنگوں کی
بے رنگ سی یہ نقاب اوڑھ کر،
ایسی یک رنگی زندگی،
موسموں کے بدلتے تناظر میں
کب تک چھپائے گا۔

بلراج راج بخشی کے شعری مجموعہ پر یہ مختصر سا تبصرہ "مٹی کے موسم" کی خوبیوں کا احاطہ نہیں کرتا لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آ کر جن گنے چنے شاعروں کی غزلیں اور نظمیں اردو شاعری کے لیے سرمایہ ثابت ہوں گئیں۔ ان میں سے ایک بلراج بخشی بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی بلراج بخشی کا یہ شعری مجموعہ "مٹی کے موسم" بحیثیت شاعر ان کا مقام و مرتبہ قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ ☆

کتاب کا نام : نورشاہ کی فکشن نگاری
مصنف : ڈاکٹر محمد مصطفیٰ بیگ
مبصر : ڈاکٹر مختار احمد

کتاب ''نورشاہ کی فکشن نگاری'' جو حال ہی میں کشمیر سے شائع ہے جس کے مصنف ڈاکٹر محمد مصطفیٰ بیگ ہیں ریاست جموں وکشمیر کے ایک معروف افسانہ وناول نگار جنھیں ادبی دنیا نورشاہ کے نام سے جانتی ہے کی پوری تخلیقات کا احاطہ کرتی ہے۔مصنف نے نورشاہ کی زندگی،تعلیم وتربیت،قلمی خدمات،انعامات واعزازات ان کے تحقیقی اور فکری شعور سمیت تمام تر جہتوں کا احاطہ کیا ہے۔نورشاہ موجودہ عہد کے ایک اہم فکشن نگار مانے جاتے ہیں۔فکشن کے میدان میں ان کے ناول اور افسانے قابلِ قدر ہیں۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ''نورشاہ: حیات وشخصیت'' پر مشتمل ہے جس میں ان کے آباواجداد کے علاوہ ان کی ابتدائی زندگی اور اس میں کارفرما متعدد پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔اس باب میں ان کی ولادت،بچپن،گھریلو ماحول،ابتدائی تعلیم،ملازمت،شادی اور ادبی زندگی کے آغاز کے علاوہ نورشاہ کی تخلیقات اوراعزاز ت وانعامات کے بارے میں بھی اظہارخیال کیا ہے۔دوسرا باب ''نورشاہ کی فکشن نگاری کا تنقیدی جائزہ'' کے حوالے سے تحریر کیا ہے جس میں مصنف نے نورشاہ کے ناولوں اورافسانوں پر اپنی تحقیقی رائے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ

ہی دوسرے ادیبوں کی رائے کو بھی شامل کیا ہے۔نور شاہ کے ان ناولوں میں جس طرح کشمیر کے حالات وواقعات کی عکاسی نظر آتی ہے اس کی مثال بہت کم ادیبوں کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک سچے فن کار ہیں ۔ یہ ناول ''نیلی جھیل کالے سائے''(۱۹۶۱ء)، ''پائل کے زخم''(۱۹۶۳ء) اور تین ناولٹ ''لمحے اور زنجیریں''(۱۹۶۵ء)''آؤ سو جائیں''(۱۹۷۱ء) ''آدھی رات کا سورج'' (۲۰۰۸ء)، قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد نور شاہ کے افسانوی مجموعوں پر بات کی ہے اور مجموعوں میں شامل افسانوں پر ایک تحقیقی رائے کا اظہار کیا ہے۔نور شاہ کا کچھ تحریر کردہ مواد نایاب ہونے کے باوجود مصنف نے ان کے ہم عصروں سے ملاقات کر کے اس مواد کو جمع کیا ہے اور اس کتاب میں شائع کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب ''نور شاہ کی دیگر تخلیقات'' پر مبنی ہے اس میں اُن تحریروں پر اظہار خیال کیا ہے جو ناول اور افسانہ کے زمرے میں شامل نہیں ہیں اُن میں ''انتخاب اردو ادب''''بند کمرے کی کھڑکی''''کہاں گئے یہ لوگ''''ریاست جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار(فن،شخصیت اور مکالمہ)''''یادوں کا سفر''''بارش کا پہلا قطرہ''''لمبی عمر کی تنہائی''''کشمیر نامہ''''کشمیر کہانی''اور''کیسا ہے یہ جنون''قابل ذکر ہیں۔ چوتھا باب ''نور شاہ کے معاصرین فکشن نگار'' پر مشتمل ہے۔اس باب میں نور شاہ کے معاصر فکشن نگاروں کی تخلیقات اور ادبی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے یہ جموں وکشمیر کے وہ فکشن نگار ہیں جن کا تعلق نور شاہ کے عہد سے ہے ۔ اِن میں ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ، موہن یاور، مالک رام آنند، آنند لہر، دیپک بدکی، ڈاکٹر برج پریمی، حامدی کاشمیری، وریندر پٹواری، خالد حسین، مشتاق احمد وانی، عمر مجید، حسن ساہو، کلدیپ رانا، مشتاق مہدی، وحشی سعید اور ترنم ریاض وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں حالانکہ مصنف کو چاہئے تھا کہ اس باب میں معاصرین پر کھل کر بات کرتے

اور ریاست کے ان ادیبوں کی ادبی تخلیقات کو بھی بروئے کار لاتے جو وقت کی ضرورت بھی ہے۔ پانچواں باب ''نور شاہ کی فکشن نگاری:عصری معنویت واہمیت'' پر مشتمل ہے اس میں نور شاہ کی ریاست اور بیرون ریاست عصری معنویت اور اہمیت کا ذکر جموں وکشمیر کے فکشن نگاروں کے حوالے سے کیا ہے۔نور شاہ نے جس طرح اپنی تحریروں میں وادی کے مسائل کو اُجاگر کرنے کی سعی کی وہ واقعی عصری عہد کا تقاضا بھی تھا اور ضرورت بھی۔ان کی تحریروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر اور کشمیریت کی عکاسی جس طرح نور شاہ نے کی ہے عصری عہد میں بہت کم ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔کتاب کے آخر میں چند کتابیات اور رسائل وجرائد کو بھی شامل کیا ہے جن سے مصنف نے استفادہ کیا ہے۔کتاب میں ٹائپنگ کے دوران کچھ جگہ پر غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کو دور کرنا بے حد لازمی ہے اس کے باوجود مصنف حوصلہ افزائی کے قابل ہے کہ جس نے وادی کے ایک نامور ناول وافسانہ نگار کی ادبی تخلیقات پر ایک بہترین کتاب شائع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو نور شاہ کے ادبی مقام کو بلند وبالا کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

اس کتاب کا مطالعہ نور شاہ کی شخصیت،تصانیف اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے درجنوں تحقیقی مقالوں کے مواد اور متن کے حصول کا وسیلہ بن سکتی ہے بہ الفاظ دیگر یہ کتاب متعدد اُردو اسکالروں کو نور شاہ اور ان کی ادبی تخلیقات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔واقعی ڈاکٹر محمد مصطفیٰ بیگ نے عرق ریزی سے نور شاہ پر کام کیا ہے۔زیرِ تبصرہ کتاب ہر لحاظ سے قارئین کے لئے قابل مطالعہ اور مفید وکارآمد ہے۔

☆☆☆

کتاب کا نام : بے سمت قافلے
افسانہ نگار : طارق شبنم
مبصر : ڈاکٹر عرفان رشید

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عرفان رشید
افسانوی مجموعہ: بے سمت قافلے
افسانہ نگار: طارق شبنم

عصر حاضر میں جموں وکشمیر میں افسانہ نگاروں کی ایک ایسی پود افسانے کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں ان میں طارق شبنم کا نام اہمیت کا حامل ہیں۔ طارق شبنم ایک ایسے فنکار ہیں جن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گمشدہ دولت'' ۲۰۲۰ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو'' بے سمت قافلے'' کے نام سے ۲۰۲۴ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۸۲ صفحات پر مشتمل ہیں جس میں ۴۴ افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے سابقہ مجموعے سے کافی معنوں میں بہتر ہے۔ اس میں موضوعاتی اور تکنیکی سطح پر کافی تجربے کیے گئے ہیں۔ زبان و بیان کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ نئے نئے تشبیہات، استعارات اور علامات سے افسانوں کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ کتاب میں شامل چند افسانوں کے متعلق اپنے کچھ تاثرات پیش کرنے کی کوشش کروں گا تا کہ قارئین طارق شبنم کے افسانوں سے متعارف ہوں۔

''اڑن طشتری'' ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں سائنس کے موجودہ منظر نامے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس

طرح آج کل کے ممالک ترقی کے نام پر ایٹم بم، ہائی ڑروجن بم اور نیکولیر بم پر کھربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں وہیں دوسری طرف عام عوام بھوک، افلاس اور غربت سے جوجھ رہی ہیں۔ کئی ممالک دوسرے سیاروں پر آباد ہونے کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہیں اور ادھر دھرتی کے باسی فوٹ پاتھوں پر اپنی جانیں دے رہی ہیں۔ افسانہ ''نیا شہر'' ایک اور افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار ایک خیالی شہر کی تصویر کھینچتا ہے جس میں امن، سکون اور شانتی ہے جہاں مکین لوٹ مار، چوری چکوری اور ڈاکہ زنی سے ماورا ہیں۔ کشمیر کے موجودہ سیاسی منظر نامے کے حوالے سے ''آئینہ فروش'' ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں موصوف نے علامتی پیرایہ اظہار کو اپنایا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے افسانہ نگار نے کئی سوالات قائم کیے ہیں جن پر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آئینہ فروش یہاں کا وہ ادیب ہے جو کئی دہائیوں سے وادی کے سیاسی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اب اس کو شرمندگی اور افسوس ہو رہا ہے کہ ''میں ایک ناکام آئینہ فروش ہوں۔۔۔ میرے سارے آئینے ناکارہ ہیں''۔

افسانہ ''شکور بھنگی'' ایک قابل مطالعہ افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے عصر حاضر کے سماج پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔ اصل میں کہانی کچھ اس طرح سے ہیں کہ شکور ایک بھنگی ہوتا ہے جو احسان احمد کی مل میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ احسان احمد ہر سال قرعہ اندازی کر کے کسی ایک مزدور کو حج کے لیے بھیجتا تھا۔ اس طرح سے قرعہ اندازی میں شکور بھنگی کا نام نکلتا ہے جس پر مل کے سبھی مزدور اسے تانے دیتے ہیں اس طرح سے شکور حج کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ لیکن جب مل کا مالک احسان احمد اسے ایک سال کا بونس کی لالچ دیتا ہے تو شکور بھنگی راضی ہو جاتا ہے۔ جب شکور بھنگی حج کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے تو احسان احمد بھی ان کے گھر جاتا ہے اور ان کی بیوی سے ملتا ہے۔ شکور کی بیوی انہیں سارا معاملہ سمجھاتی ہے اور کہتی ہے کہ اصل

میں شکور ایک بیوہ کی مدد کرتا ہے اور بیوہ ہر روز انہیں دعا دیتی ہے:

''جا میرے بھائی، میرے مددگار۔۔۔اللہ تمہیں حج کی سعادت نصیب فرمائے اور تمہارا خاتمہ ایمان پر کردے''۔

یہ واقعہ سن کر احسان احمد کو شکور بھنگی کی شخصیت پر رشک آجاتا ہے اور جب شکور حج کا فریضہ ادا کر کے سجدے میں مر جاتے ہیں تو احسان احمد کی زبان سے بے ساختہ الفاظ نکلتے ہیں:

''یا میرے مولیٰ۔۔۔مجھ گناہ گار کو بھی شکور احمد جیسی موت عطا فرماؤ''

اصل میں افسانہ نگار سماج پر طنز کرتے ہیں کہ جو لوگ دین کے ٹھیکدار بنے ہوئے ہیں وہ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس کہانی کے ذریعے کہانی کار قارئین کو احسان دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو حقارت اور ذلت کی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے کیا پتہ کب کس بندے پر اللہ مہربان ہو جائے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں کئی اور افسانے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔ مجموعے میں متعدد ایسے افسانے ہیں جو افسانے کے فن پر پورا اترے ہیں۔کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں میں طارق شبنم ایک اہم نام ہیں۔ان کا کینوس وسیع ہے اور تکنیکی سطح پر بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔اس مجموعے میں متعدد افسانے راست بیانیہ میں لکھے گیے ہیں۔بہر حال یہ مجموعہ اردو افسانے میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس حوالے سے طارق شبنم مبارکبادی کے مستحق ہیں اور مجھے امید ہے کہ قارئین اور خاص طور پر وہ اسکالرس جو جموں و کشمیر کے اردو افسانے پر کام کر رہے ہیں وہ اسے پڑھ کر مستفید ہوں گے۔

☆☆☆